سحاب قزلباش کی تصانیف کا اسلوبی مطالعہ

(افسانہ، غیر افسانوی نثر اور شاعری)

مقالہ برائے ایم ایس اُردو

مقالہ نگار

مدیحہ یٰسین

رجسٹریشن نمبر 99/FLL/MS-UR/S13

نگران مقالہ

ڈاکٹر نجیبہ عارف

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

INTERNATIONAL ISLAMIC UNIVERSITY
ISLAMABAD

International Islamic University
CENTRAL LIBRARY
Islamabad

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۸ء

9/1/2020

Acc # TH20895

Q
MS

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **Madeeha Yaseen**

Title of the Thesis: " سحاب قزلباش کی تصانیف کا اسلوبی مطالعہ (افسانہ، غیر افسانوی نثر اور شاعری) "

Registration No: 99-FLL/MSURDU/S13

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Prof. Dr. Munawar Iqbal Ahmad
Dean Faculty of Language & Literature IIUI

Chairperson Department of Urdu:

Dr. Najeeba Arif
Chairperson Department Of Urdu Female IIUI

External Examiner:

Dr.Nadeem Aslam
Govt..Asghar Mall College, Rawalpindis

Internal Examiner:

Dr. Saira Batool
Assistant Professor, Department of Urdu Female IIUI

Supervisor:

Dr. Najeeba Arif
Chairperson Department Of Urdu Female IUII

3113
04/10/18

084576

Rupees 30 ۳۰ روپیہ

بیان حلفی

میں مدیحہ یٰسین ولد غلام یٰسین رجسٹریشن نمبر 99-FLL/MS/UR/S-13 حلفیہ بیان دیتی ہوں کہ میں نے اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان "سحاب قزلباش کی تصانیف کا اسلوبی مطالعہ" ڈاکٹر نجیبہ عارف کی زیر نگرانی مکمل کیا ہے جس میں کسی قسم کی چربہ سازی اور نقل نہیں کی گئی۔ یہ کام مندوبہ کی ذاتی محنت و کاوش اور تحقیق پر مبنی ہے۔

گواہ۔

دستخط

نام: مسرت شاہین

14203-9515466-2 -NIC

ATTESTED

S.M. SAQLAIN ADVOCATE
NOTARY PUBLIC
Rawalpindi - Islamabad

Madeeha Yaseen دستخط

نام: مدیحہ یٰسین

والد کا نام: غلام یٰسین

32102-4739187-0 -NIC

الجامعۃ الإسلامیۃ العالمیۃ

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو (خواتین)

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے مدیحہ یٰسین رجسٹریشن نمبر 99-FLL/MSURDU/S13 نے ایم۔ایس اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے "**سحاب قزلباش کی تصانیف کا اسلوبی مطالعہ (افسانہ، غیر افسانوی نثر اور شاعری)**" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران

ڈاکٹر نجیبہ عارف

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

فہرست ابواب

	نام ابواب	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	iv
باب اول:	اسلوب کیا ہے؟	۱
باب دوم :	سحاب قزلباش: تعارف وادبی اہمیت	۲۳
باب سوم:	سحاب قزلباش کی افسانوی وغیر افسانوی تصانیف کا اسلوبی مطالعہ	۴۵
باب چہارم :	سحاب قزلباش کا شعری اسلو	۱۱۶
	ماحصل	۱۵۴
	مآخذ	۱۶۰

پیش لفظ

میں اس ذاتِ کریم کی شکر گزار ہوں جس نے عقل و شعور سے بہرہ ور کر کے بہترین علم کے حصول کے ذرائع میسر کیے۔ تحقیق کا عمل جستجو اور مسلسل کوشش کا متقاضی ہے۔ اس کا بنیادی فریضہ بلاشبہ نامعلوم حقائق کی دریافت ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے شفیق اساتذہ کی رہنمائی کی ہر لمحہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے میں تہِ دل سے اپنے تمام اساتذہ کرام کی شکر گزار ہوں جنھوں نے ایم ایس کے دوران ہر لمحہ میری رہنمائی فرمائی۔

سحاب قزلباش کے بارے میں مقالہ لکھنے کا خیال مجھے ڈاکٹر طیب منیر صاحب (مرحوم) کی تجویز سے ملا۔ سحاب قزلباش کا افسانوی مجموعہ ان کے پاس محفوظ تھا۔ وہ اس ادبی کاوش کو تحقیق کے ذریعے منظرِ عام پر لانے کے خواہاں تھے۔ سحاب قزلباش نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دیار غیر میں گزارا اور وہیں وفات پائی۔ اس لحاظ سے ان کے بارے معلومات حاصل کرنا کافی مشکل امر تھا۔ میں نے اپنے طور پر سحاب کے بارے جس حد تک ممکن تھا معلومات حاصل کر کے انھیں اس مقالے میں شامل کیا ہے۔

انسان کی زندگی تجربات کا خزینہ ہوتی ہے۔ ایم ایس کورس ورک کے دوران اساتذہ کے مشفقانہ انداز نے مجھے اعتماد بخشا۔ اس کاوش میں سب سے زیادہ شکر گزار ہوں ڈاکٹر طیب منیر صاحب (اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں بلند درجہ عطا فرمائے) جنہوں نے پدرانہ شفقت سے میری رہنمائی کی۔ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ان سے فیض پانے کا موقع ملا۔ افسوس بھی رہا کہ ان کے تجویز کردہ موضوع کو اپنی ملازمت اور کوتاہیوں کے سبب جلد پورا نہ کر سکی۔

میں میڈم نجیبہ عارف صاحبہ کی بہت شکر گزار ہوں جنہوں نے سر طیب منیر صاحب کی رحلت کے بعد میری بہترین رہنمائی فرمائی اور مجھے مقالہ جلد مکمل کرنے کے لیے متحرک کیا۔ ان کے مشفقانہ انداز رہنمائی اور معیار کی سختی سے یہ مقالہ مکمل ہو سکا ہے۔

میں شکر گزار ہوں اپنے تمام اساتذہ کرام کی جنہوں نے ایم ایس کے کورس ورک کے دوران میری بہترین رہنمائی فرمائی۔ ان اساتذہ کرام میں ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، ڈاکٹر حمیرا اشفاق، ڈاکٹر صباحت مشتاق اور ڈاکٹر شیراز فضل داد اور ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ شامل ہیں۔

مجھے ایم ایس اردو کی تعلیم دلوانے میں میرے والد محترم غلام یٰسین خان کی دلی خواہش رہی۔ میں شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھ پر اعتماد کیا تعلیم دلواتے ہوئے انھوں نے کبھی مجھے بیٹی تصور نہیں کیا اور حتی الامکان وسائل بروئے کار لاتے ہوئے ہر لمحہ میرے رہبر بنے۔ اس کاوش میں میری والدہ صاحبہ اور بہن بھائیوں نے بھی میری بہت ہمت بڑھائی۔ میں اپنی دوستوں کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے تحقیقی مواد کی تلاش میں مختلف لائبریریوں میں جا کر میری معاونت کی۔ مجھے امید ہے کہ میری اس تحقیقی کاوش کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

مدیحہ یٰسین

باب اول

اسلوب کیا ہے

اردو زبان وادب میں لفظ اسلوب انگریزی زبان کے لفظ style کے مترادف معانی میں استعمال ہوتا ہے جو اظہار کا انداز ہے۔ ادبی لحاظ سے اس کے مختلف مفہوم اور معانی تشکیل پاتے ہیں بحیثیت مجموعی اسلوب تحریر کو خاص معنویت عطا کرتا ہے اور مصنف کی سوچ اور خیالات کو جاذب اور دلچسپ بناتا ہے۔ مصنف اگر خیالات وافکار کو بے ترتیب انداز یا غیر موزوں الفاظ کو اظہار کا وسیلہ بنائے تو ایسی تحریر ادبی فن پارے کی حیثیت حاصل کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ جس طرح اظہار رائے کسی خیال کی ترجمانی کے لیے ضروری ہے اسی طرح اظہار کے لیے اسلوب لازمی جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلوب طرز نگارش کا نام ہے۔ اسلوب کے مختلف زبانوں میں مختلف نام ہیں لیکن بحیثیت فعل اس کا کام تحریر میں چاشنی پیدا کرنا ہے۔

اسلوب کے معانی

انگریزی زبان میں اسلوب کے لیے style کا لفظ مستعمل ہے جس کا مطلب وضع، انداز، طرح، تحریر یا تقریر ہے۔[1]

فرہنگ عامرہ کے مطابق اسلوب سے مراد ہے طریقہ، طرز، روش۔[2]

فیروز اللغات کے مطابق بھی اسلوب: (ع۔ا۔مذ) طریقہ۔ طرز۔ روش۔ کو کہتے ہیں۔[3]

نور اللغات میں اسلوب کا معانی یہ ہیں: اسلوب (ع۔ بالضم۔ مذکر) راہ۔ صورت۔ طرز۔ روش کو کہتے ہیں۔[4]

لفظ اسلوب عربی زبان سے مشتق ہے۔ *Encyclopedia of Arabic Literature* میں اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے۔

> "A mental form for metrical world combinations which is universal in the sense of confirming with any particular word combinaton. This form is abstracted by the mind from the most prominent individual word combinations and given in the imagination comparable to a mold or loom "[5]
>
> (F. Rosenthal -1967)

اسی طرح *Literary History toward a Global Perspective* کے مطابق اسلوب کا مطلب،[6] "Method, way, manner, style (e.g. of a writer)"

Dictionary of Literary Terms and Literary Theory میں اسلوب کی وضاحت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

> "The characteristic manner of expression in prose or verse; how a particular writer say things. The analysis and assessment of style involves exami - nation of a writer's choice of words, his figures of speech the devices (rhetorical and otherwise), the shape of his sentences (whether they be loose or periodic), The shape of his paragraphs. indeed of every conceivable aspect of his language and the way in which he uses it. Style defies complete analysis or definition (Remy de Gourmont put the matter tersley when he said that defining style was like trying to put a sack of flour in a thimble) because it is the tobne and voice of the writer himself; as peculiar to him as his laugh ,his walk,his handwriting and the expression on his face .The style as Buffon put it, is the man"[7]

ہنری بیل(Henri Beyle) نے اسلوب کے لیے کامل ابلاغ کے کوائف کو بروئے کار لانا لازم قرار دیا ہے۔[8]

اسلوب مصنف کی شخصیت کا پرتو قرار دیا جاتا ہے۔ مصنف شعوری و لاشعوری انداز میں اپنے خیالات اور زندگی کے تجربات سے کہانی کی ایک مکمل فضا تشکیل دیتا ہے۔ معاشرتی اثرات شخصیت کے نظریات اور عقائد پر اثر انداز ہو کر سوچ کا ایک نیا زاویہ پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اسلوب سے مراد بات کو بلیغ انداز میں پیش کرنا ہے اور وہ تمام وسائل استعمال کرنا مراد ہے جن سے کوئی ادبی تحریر موثر ثابت ہو سکتی ہو۔''[9]

طاہر فاروقی نے اسلوب کی تشکیل کے لیے پانچ بنیادی عناصر بیان کیے ہیں جو کہ مصنف، ماحول، موضوع، مقصد اور مخاطب ہیں۔ یہ عناصر مصنف کی ذہنی اپج، ذوق جمال، انفرادیت پسندی، یا مقلد کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مصنف پر اثر انداز ہونے والے عوامل میں سب سے زیادہ اس کا ماحول اور اس دور کے رونما ہونے والے واقعات ہیں جن سے متاثر ہو کر

مصنف انھیں اپنے اظہار کا ذریعہ بناتا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے مصنف کا طرز تخاطب اور زبان و بیان کا انداز تحریر میں چاشنی پیدا کرتا ہے اور اپنے مقصد کو موضوع کی مناسبت سے بہترین انداز میں پیش کر کے قاری کے دل تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ مصنف قاری کی علمی و ادبی بصیرت اور نفسیاتی شعور کو مد نظر رکھ کر رائج اسالیب میں سے موزوں تر اسلوب کا انتخاب کرتا ہے۔[10]

نثر اور شعر میں اسلوب کا فرق

اسلوب ہر صنف ادب کے لیے مختلف ہوتا ہے۔ شاعری اور نثر کا اسلوبیاتی مطالعہ مختلف انداز سے ہوتا ہے۔ شاعری میں ردیف، قافیہ اور بحور لازمی عناصر ہیں ان کے ساتھ تشبیہات و استعارات کا استعمال اور اشارے و کنائے میں اپنا مدعا پیش کرنے کا ہنر شاعری کا وصف ہے جب کہ نثر میں شعری لوازمات کا استعمال احتیاط کا متقاضی ہوتا ہے تاکہ نثری معیار شعری لوازمات کے زیر اثر رہ کر مجروح نہ ہوں۔ اسلوبی مطالعے سے مراد کسی فن پارے کے لسانی و ادبی خصائص کا تجزیہ کرنا اور اس کے ذریعے شاعر یا ادیب کی جمالیاتی اقدار کا تعین کرنا ہے۔[11]

ندرت خیال ہی اظہار رائے کے لیے کلی تصور نہیں کی جاسکتی جب تک الفاظ کے چناؤ میں سادگی و سلاست اور اختصار جیسی خوبیاں نہ ہوں۔ اسلوب کا مطالعہ باریک بینی اور گہرے مشاہدے کا مطالبہ کرتا ہے جس سے طرز نگارش پر اثر انداز ہونے والے عوامل سے بھی آگاہی حاصل کی جاسکے۔ حالی، سرسید، غالب، میر حسن اور دیا شنکر نسیم ان سب کے طرز نگارش کی انفرادیت پر داخلی اور خارجی عناصر اثر انداز ہوتے ہیں جو مصنف کی سوچ کے زاویے کی ایک خاص سمت متعین کرتے ہیں۔ اسی طرح بغور مطالعہ کیا جائے تو ان سب کا مقصد قاری کو ایک خاص زاویہ نگاہ سے روشناس کرانا اور معاشرے کو اصلاحی رجحان مہیا کرنا تھا۔ ہر ادیب اور شاعر مختلف عہد سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کے اثرات ان کی تحریروں پر بھی نمایاں نظر آتے ہیں جن میں ان کے عہد، طرز معاشرت اور سلسلہ فکر کے نمایاں رجحان شامل ہیں۔[12] آل احمد سرور خلوص اور خون جگر کو اسلوب کے لیے کافی تصور نہیں کرتے بلکہ ان کی نظر میں واضح خیال اور واضح نظر بھی ضروری ہے جس سے قاری پر مصنف کی ذہنی بالیدگی اور آمد کی کیفیت کا ادراک ہونے لگے۔[13]

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کشاف تنقیدی اصطلاحات میں اسلوب کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> ''اسلوب سے مراد کسی ادیب یا شاعر کا وہ طریقہ، ادائے مطلب یا خیالات و جذبات کے اظہار و بیان کا وہ ڈھنگ ہے جو اس خاص صنف کی ادبی روایت میں مصنف کی اپنی انفرادیت (انفرادی خصوصیات) کے

شمول سے وجود میں آتا ہے اور چونکہ مصنف کی انفرادیت کی تشکیل میں اس کا علم، کردار، تجربہ، مشاہدہ، افتادِ طبع، فلسفہ حیات اور طرز فکر و احساس جیسے عوامل مل جل کر حصہ لیتے ہیں اس لیے اسلوب کو مصنف کی شخصیت کا پرتو اور اس کی ذات کی کلید سمجھا جاتا ہے"۔[۱۴]

اسلوب کی پرداخت میں مصنف کے افکار و خیالات اور تجربات و مشاہدات ہی اثرانداز نہیں ہوتے بلکہ اس دور کے موضوعات اور سیاسی و سماجی، معاشرتی اور معاشی حالات و واقعات بھی اثرانداز ہوتے ہیں۔ مصنف جن لوگوں سے متاثر ہوتا ہے اور جن واقعات کے اثرات شعوری اور لاشعوری طور پر قبول کرتا ہے ان کے گہرے اثرات مصنف کی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں۔ مصنف دراصل اپنے معاشرے اور تہذیب کا بہترین عکاس ہوتا ہے اپنے ماحول اور عہد کی عکاسی کرتے ہوئے واقعات کی بہترین منظر کشی کر سکتا ہے۔ اس طرح کسی تصنیف کا مطالعہ کرنے سے اس عہد کی زبان، طرز معاشرت، موضوعات، مصنف کی شخصیت، سوچ، رجحانات اور سیاسی و تمدنی اثرات کا بھی پتہ چلتا جاتا ہے۔ مصنف کی تحریر اس کی ذہنی لیاقت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ایک عہد کے ادبی اور فکری عناصر بھی ادیب کی توجہ کا محور رہتے ہیں اور انہی کے زیر اثر مصنف کسی خاص صنف ادب میں طبع آزمائی کرتا ہے۔ مصنف کے الفاظ کا چناؤ اس کی روایت کا عکاس ہوتا ہے۔ دبستان دہلی اور دبستان لکھنو کی تہذیب و معاشرت، زبان و اسلوب کا واضح فرق مصنفین کی تحریروں سے ہوتا ہے۔[۱۵]

اسلوب شخصیت کی عکاسی میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ ہر ادیب اور شاعر کا مخصوص انداز بیان ہوتا ہے جو اس کی تحریر کی پہچان اور کسی حد تک خود قلم کار کی پہچان ہوتا ہے۔ اس لیے اسلوب کو شخصیت کا اظہار بھی کہا جاتا ہے۔

لیکن شمس الرحمان فاروقی Buffon کے اس قول کے اردو ترجمے سے مطابقت کو تسلیم نہیں کرتے ان کے مطابق بوفون کا اصل قول ہے(Le style (ce'st1 homme-meme' اس کے انگریزی ترجمے ' Style is the man himself' اور اس کے اردو ترجمے 'اسلوب دراصل خود شخص ہے' سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔

شمس الرحمان فاروقی اسلوب اور شخصیت کو ایک دوسرے سے جدا تصور کرتے ہیں ان کے مطابق اگر اسلوب ہی شخصیت ہے تو پھر مصنف کے اسلوب کی بجائے شخصیت کا مطالعہ کیا جائے۔[۱۶] ہر مصنف کا ایک الگ انداز نظر ہوتا ہے۔ اسلوب اچانک وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ مصنف کی سوچ کی پختگی، اظہار رائے کی آزادی اور خیالات و افکار کی احسن انداز میں ادائیگی اسلوب کی مرہون منت ہے۔ ادبی اصطلاحات میں اسلوب کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

"اسلوب فنی تجربے کے ناگہانی یا اتفاقی حسن کے بجائے اس کے طویل، ارادی اور مسلسل ارتباط کو ظاہر کرتا ہے۔"[۱۷]

مصنف کی مسلسل کاوشوں اور ادبی رجحانات کے پیش نظر اس کی سوچ میں وسعت اور انداز میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے جو واقعات کو قلمبند کرتے ہوئے اپنے تجربات واحساسات اور معاشرتی شعور کے تجزیے کے بعد افکار کو جامع اور حقائق کے عین مطابق بغیر کسی تصنع کے لبادے میں اوڑھ کر پیدا کرتا ہے۔ اسلوب تحریر میں انفرادیت پیدا کرتا ہے۔ اچھا اسلوب نفاست اور انفرادیت کی بنا پر، تحریر کو جامع خطوط پر استوار کرتا ہے۔ اگر تحریر ثقیل الفاظ اور طویل پیرائے پر مشتمل ہو تو اسلوب کی کمی کے باعث بوجھل اور قاری کی عدم توجہ کا باعث بنتی ہے۔ مصنف کا کام تحریر کے ذریعے اپنے افکار و خیالات کی ترسیل کرنا اور اپنا مدعا بیان کرنا ہے اگر مصنف کسی معاشرتی، معاشی یا تخیلاتی افکار کو انفرادیت بخشنے میں ناکام رہا ہے تو اس کی تحریر بے معنی لفظوں کا مجموعہ بن جاتی ہے اور قاری کی توجہ حاصل کرنے سے قاصر رہتی ہے۔

اچھے اسلوب کی مثال گویا موتیوں کو نہایت خوبصورتی سے لڑی میں پرونا ہے۔ اسلوب میں انفرادیت موزوں الفاظ کے انتخاب اور منفرد طرز اظہار سے سامنے آتی ہے۔ اسلوب کے حوالے سے مختلف آراء پیش کی گئی ہیں۔ ہر مصنف کا اپنا نقطۂ نظر اور چیزوں کو جاننے، پرکھنے اور رائے پیش کرنے کا اپنا ایک الگ انداز ہوتا ہے۔ اسلوب کے حوالے سے اس کی کوئی کلی شرط متعین نہیں کی گئی۔

> ''اسلوب زیور ہے ادبی اظہار کا جس سے ادبی اظہار کی جاذبیت، کشش اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔''[18]

آل احمد سرور اس بات سے اختلاف کرتے ہیں ان کے مطابق:

> ''کچھ عرصے پہلے تک اسٹائل یا اسلوب کو ایک زیور سمجھا جاتا تھا۔ مگر زیورات کی کثرت دولت کی پہچان ہو تو ہو، ذوق کا پیمانہ ہر گز نہیں۔ پھر آرائش و زیبائش کے اس تصور کے مطابق اسٹائل ایک خارجی اور سطحی خصوصیت بن جاتا ہے جو وہ یقیناً نہیں ہے۔''[19]

ادبی حوالے سے یہ ضروری ہے کہ فکر کو لطف بیان کی خوبی سے معمور کر کے سچائی اور دیانتداری سے دوسروں تک خیالات کو منتقل کیا جائے۔ اسلوب کی حیثیت خارجی لباس کی ہے لیکن فکر اور لباس یعنی داخلی و خارجی کیفیات میں توازن ہی ادب میں جمال پیدا کرتا ہے۔ اسلوب کے لیے فکر و لطف کے ساتھ ہیئت اور طریقہ کار بھی اہمیت رکھتا ہے کہی ہوئی بات کو دوبارہ کہنے سے تحریر کی شائستگی مجروح ہو کر ایک مخصوص پیرائے سے آگے نہیں نکل پاتی۔ وحدت تاثر موضوع کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ مختلف اصناف ادب میں ترتیب و تشکیل کا طریقہ مختلف ہوتا ہے لیکن وحدت خواص ہی موضوع میں مطابقت اور ہم آہنگی لاتے ہیں۔ ناول میں کرداروں کی سوچ، فکر، مزاج سب تنوع

لیے کہانی کی شکل و ترتیب کے فرائض بخوبی نبھاتے ہوئے ایک منطقی انجام تک لاتے ہیں ان سب میں تناسب کی فضا قائم رکھنا مصنف کا اولین مقصد ہوتا ہے۔ وحدت تاثر اس مرکزی کردار کی حیثیت سے مسلم اہمیت رکھتا ہے جس طرح ناول یا افسانے میں مرکزی کردار، یا شاعری میں تصور محبوب یا اصل مدعا کی عدم موجودگی۔ اس کے بغیر موزوں لطافت کے خارجی عناصر کی بھرمار کر کے بھی فکر کا ملکہ حاصل نہیں کر پاتا۔ ادیب اور شاعر کی مثال اس مصور یا نقاش کی ہے جو رنگوں کے استعمال سے ایک خوبصورت پیکر تخلیق کرتا ہے بالکل اسی طرح مختلف عناصر کی ہم آہنگی سے شاعر یا ادیب اپنے افکار بیان کرتا ہے۔ ان میں سے کسی بھی عنصر کی کمی سے بہترین تحریر منظر عام پر نہیں آسکتی۔[۲۰]

اسلوب طرز ادا میں نفاست، تراکیب کے بر محل استعمال اور مناسب الفاظ کے مناسبت سے استعمال کا نام ہے۔ اسلوب کے لیے کوئی خاص پیمانہ متعین نہیں۔ ہر ادیب کا ایک الگ طرز فکر اور طرز ادا ہوتا ہے جس کے وسیلے سے وہ قاری کو اپنا ہمنوا بنالیتا ہے۔ ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی اسلوب کے لیے وضوح، قوت اور جمال کو بنیادی اہمیت گردانتے ہیں جن سے عقلی و شعوری بنیادوں پر ذوق جمال کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مدعا کے بہترین اظہار کے لیے ایجاز و اطناب، صنائع بدائع اور تلخی و درشتی کے الفاظ بھی تحریروں میں جگہ پاتے ہیں جو تحریر کے فطری اثر کو اجاگر کرنے میں معاونت دیتے ہیں۔[۲۱]

اسی طرح ڈاکٹر سید عبداللہ اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

> ''سٹائل صرف خارجی خصائص تحریر کا نام نہیں بلکہ مصنف کی شخصیت کے داخلی نقوش اور اس کا طرز مشاہدہ ہی نہیں بلکہ اس کا طرز احساس بلکہ اس سے آگے بڑھ کر مصنف کے زمانے، قوم بلکہ اس کی پوری تہذیب کے نقوش کا نام ہے۔''[۲۲]

ڈاکٹر سید عبداللہ اسلوب کے وسیع تر معنوں میں داخلی اور خارجی احساسات کے ساتھ ساتھ اسے تہذیب کی نمائندگی کا ذریعہ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اسلوب جس طرح مصنف کے احساسات کے ترجمانی کرتا ہے اسی طرح قوم و ملک کی تہذیب اور عہد کو روشناس بھی کراتا ہے۔ دنیائے ادب میں وقت کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔ تہذیب و تمدن میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ زبان و بیان میں بھی نئے الفاظ نے جگہ بنائی ہے اور پرانے الفاظ کو وقت کے ساتھ ساتھ متروک قرار دیا گیا ہے۔ زبانیں اپنے اندر ہر عہد کی تبدیلیوں کو سمو لیتی ہیں اور ادب انہی تبدیلیوں کو رقم کرتا ہے ادب کا فریضہ ہے کہ ایک خاص عہد میں ہونے والی معاشرتی، معاشی اور لسانی تبدیلیوں کو اپنے اندر سمو کر عہد کی جھلک پیش کرنا ہے۔ اسی طرح ایک ہی عہد کے مختلف ادیب مختلف اصناف ادب کو روشناس کرانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ کسی عہد کی ایک

تصنیف کو پڑھ کر اس عہد کا کلی تجزیہ نہیں کر سکتے بلکہ ایک تصنیف کسی ایک صنف ادب کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور اس میں صنف ادب کے ساتھ مصنف کے اسلوب کا بھی عمل دخل ہوتا ہے جو عہد کے ساتھ مصنف کی شناخت ہے۔

گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> ''اشخاص اور اصناف سے ہٹ کر اسلوبیاتی تجزیے کی ایک جہت اور بھی ہے چونکہ ادبی ارتقا میں اظہار کے لسانی پیرائے عہد بہ عہد تبدیل ہوتے رہتے ہیں اسلوبیات کی مدد سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کس عہد میں کونسا اسلوب رائج تھا یا کسی عہد کی زبان کے لسانی امتیازات کیا تھے۔''[۲۳]

اسلوب عصری حیثیت کے تعین میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ الفاظ اور اسلوب کا مطالعہ الگ الگ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ الفاظ ہی جملے کی بناوٹ کا ذریعہ ہیں۔ ان کی تراش خراش اور قوت اظہار کی انفرادیت جملے کو معنویت بخشتی ہے۔ علم لسانیات میں لفظوں کی بناوٹ، ساخت، امدادی افعال، اسم اور فعل وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے جبکہ ادبی اسلوبیات میں ادبی اظہار کی ماہیت، خوبیوں اور دیگر عوامل کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے مختلف آرا ملتی ہیں۔ مرزا خلیل احمد بیگ اسلوبیات اور لسانیات کو ایک دوسرے سے مربوط کرتے ہیں۔

> ''اسلوبیات یا لسانی اسلوبیات ادب کے لسانیاتی معالعے، یعنی ادب میں زبان کے استعمال یا ادبی زبان کے مطالعے اور تجزیے کا نام ہے جو لسانیات کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ہر لسانیاتی مطالعہ اسلوبیاتی مطالعہ قرار نہیں دیا جاسکتا، لیکن ہر اسلوبیاتی مطالعہ لسانیاتی مطالعہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ ادب کے اسلوبیاتی مطالعہ کی بنیاد لسانیاتی تجزیے پر رکھی جاتی ہے۔''[۲۴]

اردو میں اسالیب نثر کا ارتقائی مطالعہ

اردو زبان کے آغاز وارتقا میں اسالیب کا تنوع ملتا ہے۔ اردو نثر کے ارتقا میں فارسی زبان کو کلیدی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ابتدائی ادوار میں نثر نگار مقفّٰی و مسجع اور پیچیدہ طرز پر لکھنے کی طرف مائل رہے۔ پر تکلف اور رنگین عبارت اردو نثر کی شان سمجھی جاتی۔ نثر کی بجائے نظم کو خاص فوقیت حاصل تھی۔ اردو نثر کی ابتدا فارسی اور عربی کی کتب کے تراجم سے ہوئی ہے جن سے رائج الوقت زبان اور اسلوب کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ اردو نثر کا آغاز تقریباً آٹھویں صدی ہجری سے ہوا۔ اس دور کی نثر کے شواہد چھوٹے چھوٹے مذہبی رسائل کی صورت میں ملتے ہیں جن میں دکن اور گجرات کے فقراء نے اقوال لکھے۔ ادبی حوالوں سے ان رسائل کی حیثیت نہیں لیکن ان کے مطالعہ سے اس دور میں بولی اور لکھی جانے والی زبان سے واقفیت ملتی ہے۔ ان رسائل میں 'معراج العاشقین' (حضرت خواجہ گیسودراز)، 'نشاط العشق'

(شیخ عبدالقادر جیلانی)، 'شرح مرغوب ا لقلوب' (میراں جی شمس العشاق) اور 'سب رس' (ملا وجہی) شامل ہیں۔ جن کا موضوع تصوف تھا۔ انداز بیان کے لحاظ سے سادہ اور سلیس دکنی زبان میں لکھے گئے۔[۲۵]

'سب رس' کو اردو نثری ادب میں فوقیت حاصل ہے۔ وجہی کی 'سب رس' شعر و نثر کی چاشنی، فصاحت و بلاغت، سادگی اور بے ساختگی لیے ہے۔ وجہی کو زبان و بیان پر اس قدر عبور تھا کہ مضمون کو جس رنگ سے چاہتا باندھ لیتا۔ مقفٰی و مسجع نثر لکھنا بہت مشکل امر ہے۔ وجہی کی یہ خوبی ہے کہ وہ قافیہ در قافیہ لکھتا چلا جاتا۔ طوالت کے باوجود اس کی تحریر میں کہیں جھول اور باتوں کی تکرار نہیں بلکہ کہانی بیان کرتے ہوئے وحدت تاثر کی کیفیت نظر آتی ہے۔ وجہی نے قافیہ پیمائی سے واقعات کی حسین منظر کشی کی ہے۔ وجہی نے اس صوفیانہ تمثیل میں متصوفانہ انداز بھی اپنایا ہے اور مختلف موضوعات پر آسان انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ وجہی کو زبان و بیان پر خاص عبور حاصل تھا اس کی عکاسی سب رس میں عربی و فارسی کے علاوہ دیگر مقامی زبانوں کے الفاظ و مرکبات، محاورات کا استعمال اور کہاوتوں سے ہوتا ہے۔ اس کا مقصد صرف معلومات کی ترسیل یا پند و نصیحت کی بھرمار نہیں بلکہ ادب کو تحریر کی نئی جہتوں سے روشناس کرانا ہے۔ سب رس ملا وجہی کا تخلیقی کارنامہ نہیں بلکہ فارسی شاعر محمد یحییٰ بن سبیک فتاحی کے قصے 'حسن و د ل' کا ترجمہ ہے لیکن اس کے باوجود اس میں وجہی کے ندرت بیان نے نثر اور نظم کا حسین امتزاج پیش کیا ہے جو زندگی کے تجربات کا نچوڑ لیے کتابِ دانش کی حیثیت رکھتی ہے۔[۲۶]

اسی طرح سترھویں صدی میں فضلی کی 'دہ مجلس' پیچیدہ اور پر تصنع انداز کے باوجود اپنے عہد کی نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ 'دہ مجلس' کا موضوع مذہبی ہے۔ اسی طرح سے امیر خسرو کے فارسی قصہ 'چہار درو یش' کو میر محمد عطا حسین خان متخلص بہ تحسین نے 'نوطرز مرصع' کے نام سے ترجمہ کیا۔ 'نو طرز مرصع' اپنے اسلوب بیان اور رنگینی عبارت کے لحاظ سے دلچسپی کی حامل رہی۔ اس میں فارسی و عربی زبان کے الفاظ کا بہت عمل دخل تھا، لیکن اپنی معنویت اور قصے کی طرز کے سبب ڈاکٹر گلکرسٹ کی نظر انتخاب بن کر میر امن دہلوی کی پر اثر و سلیس زبان اور بہترین اسلوب سے 'باغ و بہار' کے نام سے ترجمہ ہو کر اردو ادب کی تاریخ میں لازوال قصے کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اس کتاب کی سلاست و روانی، لفظوں کی ساخت اور بہترین اسلوب کی بنا پر رام بابو سکسینہ میر امن کی اس کاوش کو اس انداز میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

''تحسین کے ترجمہ کو میر امن نے اپنی زبان میں لکھا ہے کیوں کہ اس میں اکثر غیر مانوس فارسی و عربی الفاظ تھے جن کو میر امن نے نکال دیا اور اپنی کتاب کو اس قدر صاف و سلیس و بامحاورہ عبارت میں لکھا کہ بقول سرسید مرحوم کے جو مرتبہ میر تقی میر کو نظم میں حاصل ہے وہی میر امن کو نثر میں ہے۔''[۲۷]

۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک ہندوستان میں مغلیہ دور حکومت رہی۔ اس دور میں فارسی زبان کو ہندوستان کی دفتری زبان کی حیثیت حاصل تھی جبکہ اردو زبان عوام کی زبان کہلائی جاتی تھی۔ ۴ مئی ۱۸۰۰ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ ویلزلی نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا افتتاح کیا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ اس کالج کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اس کالج کا بنیادی مقصد انگریزوں کو ہندوستان کی مقامی زبان سے روشناس کروانا تھا۔ اس مقصد کے لیے ہندوستان کی دیگر مقامی زبانوں کو چھوڑ کر ایک نئی زبان اردو کو شرف قبولیت بخشی گئی۔ اس وقت اردو زبان میں علم و ادب کا خزینہ چند ایک تصانیف اور رسائل پر مبنی تھا اور ان پر بھی فارسی زبان کی گہری چھاپ تھی۔ ڈاکٹر گلکرسٹ چار سال تک فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل رہے۔ اتنے قلیل عرصے میں انھوں نے اردو کی نہایت نادر کتب کے تراجم کروا کر اردو ادب کو بیش قیمت ادبی سرمایہ مہیا کیا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کو اردو زبان و ادب سے بے حد شغف تھا۔ انھوں نے فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل انگریزوں کو اردو زبان سے روشناس کروانے کے لیے چار کتابیں لکھیں۔ ان کی تصانیف 'انگریزی ہندوستانی ڈکشنری' دو حصوں میں (مطبوعہ ۱۷۸۹ء) 'ہندو ستا نی گرا ئمر' (مطبوعہ ۱۷۹۶ء) اور 'ہندو ستا نی فلالو جی' ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد ڈاکٹر گلکرسٹ کی زیر صدارت اردو ادب کی تصنیف و تالیف کے میدان میں ایسے کارنامے انجام پائے جو ہمارے لیے باعث افتخار ہیں۔ انگریزوں کو ہندوستان کی مقامی زبان اردو سے روشناس کروانے کے لیے درس و تدریس کا آغاز کیا گیا اور اس کام کے لیے اردو زبان کے قابل افراد کی معاونت حاصل کر کے دیگر زبانوں کی کتب کے تراجم کرائے گئے۔ اس مقصد کے لیے فورٹ ولیم کالج کی زیر نگرانی کام کرنے والوں میں میر بہادر علی حسینی، میر شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، مظہر علی خاں ولا، میر امن، کاظم علی جواں، للوجی لال کوی، بنی نرائن جہاں، مرزا علی لطف اور نہال چند لاہوری جیسی شخصیات شامل تھیں جنھوں نے قابل قدر تصانیف تالیف کیں۔ میر بہادر علی حسینی نے 'اخلاق ہندی'، 'نثر بے نظیر' اور 'تاریخ آسام'، میر شیر علی افسوس نے 'گلستان' کا ترجمہ 'باغ اردو' کے نام سے کیا۔ حیدر بخش حیدری نے 'تو تا کھا نی'، 'آ ر ا ئش محفل'، 'گلدستہ حید ری'، 'گلزار دانش'، 'ہفت پیکر'، 'تاریخ نادری' اور 'گل مغفرت' جیسی کتابیں لکھیں۔ اسی طرح مظہر علی خان ولا نے 'مادھونل'، 'بیتال پچیسی' اور 'ہفت گلشن' کا ترجمہ کیا۔ علاوہ ازیں 'پند نامہ' منظوم،

'لطائف و ظرائف'، 'تاریخ شیر شاہی' اور 'جہانگیر شاہی' کے مترجم ہیں۔ کاظم علی جواں نے 'شکنتلا ناٹک' اور 'سنگھاسن بتیسی' کا ترجمہ کیا۔ برج بھاشا سے ہندی میں منتقل کرنے کے لیے للوجی لال کوی نے کاظم علی جواں کی معاونت کی۔ بینی نرائن جہاں 'چار گلشن'، 'گلزار حسن'، 'بہار عشق'، 'دیوان جہاں'، 'قصہ گل صنوبر'، 'باغ عشق' اور 'تنبیہ الغافلین' کے مترجم اور مولف ہیں۔ نہال چند لاہوری نے 'گل بکاؤلی' کے فارسی قصے کو مذہب عشق کے نام سے اردو میں منتقل کیا۔ اسی طرح میر امن دہلوی نے 'باغ و بہار' اور 'گنج خوبی' کا ترجمہ کیا۔ لیکن ان سب تصانیف میں سب سے زیادہ شہرت پانے والی تصنیف 'باغ و بہار' ہے۔ 'باغ و بہار' کے سہل ممتنع اسلوب اور مقامی زبان و معاشرت نے داستان کو زندہ جاوید بنا دیا۔ 'باغ و بہار' کی مقبولیت کا سبب سلیس و فصیح زبان، محاورات کا بر محل استعمال اور بے مثل اسلوب بیان ہے۔ دہلوی زبان کی رچاوٹ نے قصے کی جاذبیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ اردو ادب کی دوسری داستانوں کے برعکس میر امن کے اسلوب میں روانی ہے۔ وہ ماہر داستان گو کی طرح ماحول اور کردار کی عکاسی ایک تواتر سے کرتے ہیں کہ تحریر میں کہیں جھول یا بے ربطی کا شائبہ تک نہیں گزرتا۔ انھوں نے منظر نگاری کرتے ہوئے مرقع نگاری اور جزئیات نگاری سے کام لے کر زندہ تصویریں پیش کی ہیں۔[۲۸]

باغ و بہار کے جواب میں مرزا رجب علی بیگ سرور نے داستان 'فسانۂ عجائب' لکھی۔ بعد ازاں فخر الدین حسین نے 'سروش سخن' اور منشی جعفر علی شیون کاکوری نے 'طلسم حیرت' لکھی۔ 'فسانۂ عجائب' کی عبارت عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش سے مقامی زبان اور لب و لہجے سے یکسر مختلف ہے۔ سرور نے واقعات نگاری کے لیے شاعری کا سہارا لیا اور دوسرے قابل قدر شعرا کی نسبت ان کے اپنے شعروں کی کثرت پائی جاتی ہے۔ انہوں نے عام بول چال کی سلیس زبان کی بجائے مقفیٰ و مسجع سے کام لے کر تصنع کے عنصر کو نمایاں کیا ہے۔

اردو ادب کی ابتدا شاعری سے ہوئی جس میں فارسی زبان کی آمیزش سے اردو پر فارسی کے گہرے اثرات مرتب ہونے لگے۔ قادر الکلام شعرا نے اپنے کلام میں ایک مصرع فارسی اور دوسرا مصرع اردو کا لکھ کر فارسی کی اہمیت کو واضح کیا۔ فارسی زبان کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو غالب کے کلام سے لے کر اقبال تک کی شاعری میں فارسی کے باکثرت الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اقبال کا تقریباً آدھا کلام فارسی زبان میں اور آدھا کلام اردو زبان میں موجود ہے۔ غالب نے اپنی شاعری میں انفرادیت کو معیار بنایا۔ انہوں نے شاعری کے آغاز میں فارسی شعرا کا تتبع کیا اور انہی کے انداز میں مشکل فارسی تراکیب اور نادر تشبیہات و استعارات کے استعمال سے تقلیدی روش اختیار کی۔ جلد ہی فارسی کا اثر ان کی شاعری سے زائل ہوا اور پھر انہوں نے نئے انداز سے شاعری کا آغاز کیا۔ جو غالب کا انداز سخن قرار پایا اور اردو ادب کو ایک لازوال شاعری

کے خزانے سے مالامال کر گیا۔ غالب کی یہی انفرادیت اردو نثر میں بھی بے مثل قرار پائی۔ انہوں نے روایتی انداز تحریر سے ہٹ کر اپنے لیے ایک نئی راہ متعین کی اور پھر اردو ادب کو ایک جاوداں انداز بیان سے روشناس کرایا۔ غالب کی نثر خطوط پر مشتمل ہے جس میں انہوں نے اپنے قریبی دوستوں کو روز مرہ کے سلیس و رواں انداز سے مخاطب کر کے مکالمے کا تاثر پیدا کیا۔ ان کے خطوط فاصلوں کی دوری نہیں بلکہ دوستی اور رفاقت کا احساس دلاتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مخاطب سے بے تکلفی کا عنصر بھی ملتا ہے اور تحریر کے جامد اور بوجھل تاثر کی بجائے شگفتگی اور رنگینی بیان بھی ملتا ہے۔ غالب کی شخصیت کی عکاسی ان کے شعری کلام سے زیادہ ان کے خطوط میں ہوتی ہے جس سے غالب کے حالات زندگی سے واقفیت بھی ہوتی ہے اور پر مزاح انداز سے غالب کی حس ظرافت کا پتہ بھی چلتا ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد مسلمانوں کی بیداری کے لیے سر سید احمد خان نے معاشرتی، معاشی اور سیاسی موضوعات کو اردو ادب میں رواج دیا۔ ان کے رفقائے کار ڈپٹی نذیر احمد، شبلی، حالی، اور اس دور کے نامور انشاپرداز مولانا محمد حسین آزاد نے اردو ادب کو جدت انداز سے رہنمائی بخشی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ناول نگاری کے ذریعے معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ شبلی نعمانی نے اسلامی تاریخ کی نامور شخصیات کی سوانح قلمبند کر کے زندگی کی جامع تصویر پیش کی۔ حالی نے شاعری کے ذریعے اصلاح معاشرہ اور معاشرتی و اخلاقی اقدار کی ترویج کو وسیلہ بنایا۔ انھوں نے شاعری میں تنقید کا شعور اجاگر کیا۔ ساتھ ہی تین قابل قدر شخصیات کی سوانح لکھ کر ان کی قدر و منزلت کا احساس دلایا اور ان کی کاوشوں کو خراج عقیدت پیش کی۔ قابل قدر سوانح حیات 'یاد گار غالب'، 'حیات سعدی' اور 'حیات جاوید' ہیں۔ 'حیات جاوید' میں عہد رفتہ کے مسلمانوں کو ایک مخلص اور دردمند انسان کی علمی و تحقیقی کاوشوں سے روشناس کرایا گیا۔ اسی طرح مولانا محمد حسین آزاد نے انشاپردازی کے بہترین جوہر آزمائے۔ ان کا انداز تحریر اپنے اسلوب کی معنویت کے لحاظ سے قاری کو آخری حرف تک پڑھ لینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ سر سید احمد خان کی نثر کا اسلوب صحافتی اور اصلاحی نوعیت کی بنا پر جمالیاتی عنصر کی کمی لیے ہے۔

داستان گوئی کے اختتام کے ساتھ ہی اردو ادب نے ایک نئی کروٹ لی اور ناول نگاری کا آغاز ہو گیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کو اردو ادب کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے جس نے اردو ادب کو تخیل اور رومان کی دنیا سے نکال کر حقیقت کی زندگی سے روشناس کرایا اور اسے محض تفریح طبع سمجھنے کی بجائے معاشرتی اور اخلاقی اقدار کی پرورش کا ذریعہ بنانے کی سعی کی۔ ان کا پہلا ناول 'مراۃ العروس' معاشرتی و اخلاقی اچھائیوں اور برائیوں کی تصویر کشی کر کے اچھے اور برے کا تقابل کرتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر ناولوں میں 'بنات النعش'، 'فسانہ مبتلا'، 'توبتہ النصوح'، اور 'ابن الوقت' شامل

ہیں۔ان سب کے موضوع اصلاحی اور بالحاظ اسلوب عالمانہ اور ناصحانہ انداز پر مشتمل ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے ناول اچھائیوں اور برائیوں کا تقابل پیش کرتے دل کو بھلے لگتے ہیں۔ڈپٹی نذیر احمد کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے۔'مراۃ العروس' میں عورتوں کی زبان میں بامحاورہ انداز سے دہلی طرز معاشرت کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔

سرشار اور شرر نے بھی اپنے ناولوں میں سادہ اسلوب کو رواج دیا اور مقفٰی و مسجع عبارت کو خیر باد کہا لیکن اس کے باوجود کہانی کو طرب انگیز انجام دینے کی کوشش میں تخیل کی آمیزش اور شاعرانہ اسلوب کا غلبہ قاری کو راغب کرنے لیے داستان سے مستعار لیا گیا۔ سرشار نے فسانہ آزاد میں بیان کی صنعت گری اور واقعہ نگاری سے فہم وادراک کی مثالیں دے کر داستانوں کے طرز کو اپنایا ہے۔[۲۹] فسانہ آزاد میں ہیرو آزاد اور خوجی کا کردار دو متضاد نوعیت کے حامل ہونے کے ساتھ لکھنوی معاشرت کی تصویر پیش کرتے مصنف کی ذہانت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر ان کے اسلوب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔ سرشار فقرے نہیں قلمبند کرتے پٹاخے چھوڑتے اور انار چلاتے ہیں۔ناول کیا ہے پر لطف واقعات ،چلبلے اسلوب اور ہنس مکھ کرداروں کی آتش بازی کا میلا ہے۔''[۳۰]

عبدالحلیم شرر نے ناولوں میں تاریخی واقعات کو موضوع بنایا ان کے ناول 'ملک العزیز ورجینا'، 'دل گداز' اور 'فردوس بریں' قابل ذکر ہیں۔ مرزا ہادی رسوا اردو ادب میں ناول نگار کی حیثیت سے قابل قدر منصب پر فائز ہیں۔انھوں نے 'امراؤ جان ادا' کے ذریعے معاشرتی استحصال کا شکار طبقے کی عکاسی کی ہے۔'امراؤ جان ادا' کا کردار طوائفوں کے طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ رسوا نے اس ناول کے ذریعے انسانی نفسیات کی حقیقی اور جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر ناول 'امراؤ جان ادا' کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

> ''مرزا رسوا کے قلم کی بدولت اردو ناول پہلی مرتبہ حقیقت نگاری کے ذائقہ سے آشنا ہوا۔ کرداروں کی مثالیت ختم کر کے انھیں زندہ افراد کی نفسیاتی کیفیات کا آئینہ دار بنا دیا گیا۔''[۳۱]

اسی طرح مرزا محمد سعید کا ناول 'خواب ہستی' انفرادیت لیے ہے ناول میں ادب اور روحانیت کے تجربات کیے گئے ہیں۔ دیگر ناول نگاروں میں ممتاز مفتی کا 'علی پور کا ایلی'، شوکت صدیقی کا 'خدا کی بستی'، جمیلہ ہاشمی کا 'دشت سوس'، ڈاکٹر احسن فاروقی کا 'شام اودھ' اور قرۃ العین حیدر کا 'آگ کا دریا' قابل ذکر ہیں۔ان ناول نگاروں نے بہترین ناول لکھ کر اس صنف کو آگے بڑھایا۔[۳۲]

انیسویں صدی کے اواخر میں اردو افسانے کا آغاز ہوا۔ پریم چند کو اردو ادب کا پہلا افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ انھوں نے زندگی کے مد و جزر اور سیاسی و سماجی حالات کو مد نظر رکھ کر حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔ پریم چند نے ہندوستان کی دیہی زندگی کو موضوع بنایا۔ ان کے افسانوں میں ہندوستانی معاشرے کی ہو بہو تصویر ملتی ہے۔ ان افسانوں میں نو آبادیاتی نظام کے دیہی زندگی پر پڑنے والے اثرات اور ظلم و ستم کا شکار عوام کی منظر کشی ہے۔ پریم چند انقلاب کے خواہاں تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے پسماندہ طبقے کو ان کا حق دلانے کی کاوش میں اپنے قلم کے ذریعے تحریک کو جلا بخشی اور وقت و حالات سے مصلحت کے ساتھ حقوق کی پاسداری کو لازم قرار دیا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانے کفن میں زندگی کی تلخ اور بے رحم کیفیت کو بیان کیا ہے۔ وقار عظیم لکھتے ہیں:

> ''کفن زندگی کے گہرے اور ہمدردانہ مشاہدے اور مطالعے، تخیل اور فکر کی متوازن آمیزش اور فن کے مخلصانہ احساس کے ربط و آہنگ کا مثالی نمونہ ہے۔''[۳۳]

اسی طرح افسانے 'سوا سیر گیہوں'، 'دودھ کی قیمت'، 'دو بیلوں کی کھانی' اور 'پوس کی رات' غربت، استحصال اور ذہنی و معاشی ناآسودگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ پریم چند جانوروں کے ذریعے احساسات و نظریات بیان کر کے انسان کی خود غرضی اور بے حسی پر طنز کرتے ہیں۔ انھوں نے دیہات کی زندگی اور فطرت کے رنگا رنگ نظاروں کا مشاہدہ کر کے انہی سے تشبیہات و استعارات لے کر منظر کشی کی اور حقیقت نگاری نے اسلوب کو اور بھی معنویت بخش دی۔ انھوں نے ٹھیٹھ دیہاتی زبان کے الفاظ و محاورات اور کہاوتوں سے کام لیا۔ وقار عظیم پریم چند کو قدر و منزلت اور ادبی رتبے کے لحاظ سے عالمی درجہ کے ادیبوں کے ہم پلہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''پریم چند کے ناول بہ یک وقت ٹالسٹائی کی وسیع النظری اور ڈکنس کی مردم شناسی کے حامل بھی ہیں اور مشرقی مزاج کے صحیح آئینہ دار بھی۔''[۳۴]

ٹالسٹائی دنیائے ادب کے نامور روسی ادیب ہیں جنھوں نے 'جنگ اور امن'، 'اینا کرنینا' جیسے ناول لکھ کر ادب کو معنویت بخشی۔ ان کے ناول روسی زندگی کی حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح چارلس ڈکنز برطانیہ کے نامور ناول نگار جنھوں نے اے کرسمس کیرول (A Chrismas Carol) نکولس نکل بے (Nicholas Nickleby)، ڈیوڈ کاپر فیلڈ (David Copperfield) اور اولیور ٹوسٹ (Oliver Twist) جیسے بے مثال ناول لکھے۔[۳۵]

پریم چند کے ساتھ ساتھ سجاد حیدر یلدرم نے بھی اردو ادب کو ایک نئی سمت متعین کرنے میں مدد دی اور اردو افسانہ محض اصلاح پسندی اور حقیقت نگاری تک محدود نہ رہا بلکہ اس میں رومانویت نے بھی جگہ بنائی۔ یلدرم کے افسانوں پر

ترکی ادب کا گہرا اثر ہے۔ پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم نے ایک ہی دور میں حقیقت نگاری اور رومانویت کے اسلوب کو پروان چڑھایا۔ پریم چند کی تقلید کرنے والوں میں اعظم کریوی، علی عباس حسینی، احمد اکبر آبادی اور سدرشن نے حقیقت نگاری کو پروان چڑھانے میں مدد دی۔ یلدرم کے ہاں داستانی تکنیک کا استعمال بھی عام ملتا ہے۔ ان کی پہلی تصنیف 'خارستان وگلستان' میں داستانی طرز پر قدیم روایت سے پلاٹ تشکیل دیا گیا ہے۔ ان کے افسانوں میں متنوع موضوعات لیے گئے ہیں جن میں ڈرامائی انداز، نفسیاتی و جذباتی کشمکش اور تضاد کی تکنیک کی مثالیں ملتی ہیں۔ یلدرم کے افسانوں میں شعریت، سحر انگیزی اور رنگینی بیان سے قاری کو حقیقت سے دور خیالوں کی ایک خوبصورت دنیا ملتی ہے۔ وہ تشبیہات واستعارات کی مدد سے تحیر کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ یلدرم نے سلیس اور شگفتہ نثر کے ذریعے ترکی طرز تحریر اور اچھوتے خیالات کو افسانوں میں سمویا۔ پروفیسر محمود الٰہی 'انتخاب سجاد حیدر یلدرم' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''یلدرم کی نثر وہ ترجموں میں ڈھل کر نکلی ہو یا ان کے ذاتی تجربات اور افکار کا آئینہ بن کر سامنے آئی ہو۔ ایک نئے اسلوب کی حامل ہے اس سے جہاں ایک طرف ادب لطیف کے سوتے پھوٹتے ہیں وہاں دوسری طرف اس نے ایک منزل کی نشاندہی کی ہے جہاں اردو ادب عالمی ادبیات کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔''[۳۶]

افسانہ نگاروں نے مختلف ادوار میں اردو ادب کو نئے موضوعات، اسلوب اور تکنیک کے لحاظ سے بہترین افسانے مہیا کیے۔ جن میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ افسانہ نگار معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے جو معاشرتی و معاشی اور سیاسی تناظر کا بغور مطالعہ کر کے انہی کے اثرات کو اپنے افسانوں میں پیش کرتا ہے۔ اردو افسانہ میں حقیقت نگاری اور رومانویت نگاری نے ایک ہی دور میں پرورش پائی۔ اس دور کے افسانہ نگاروں نے ادب کی وسعتوں میں اضافہ کرتے ہوئے مغربی ادب کے بہترین افسانوں کے اردو زبان میں تراجم کر کے مغربی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کی ہے۔ ان میں بیشتر افسانے کامیاب بھی ہوئے اور بعض اپنی معاشرتی تبدیلیوں اور مغربی و مشرقی ماحول اور مزاج کے فرق کے باعث سند قبولیت حاصل نہ کر سکے۔ ۱۹۳۲ء میں سجاد ظہیر کی زیر ادارت شائع ہونے والے افسانوی مجموعے 'انگارے' نے اپنے موضوعات کے باعث تنازعات کا سامنا کیا اور بالآخر حکومت کی جانب سے اس کتاب کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ افسانوی مجموعے 'انگارے' میں سجاد ظہیر کے علاوہ ڈاکٹر رشید جہاں، محمود الظفر اور احمد علی، نے افسانے لکھے انہوں نے اپنے افسانوں میں جذباتیت اور جنسی ناآسودگی کو موضوع بنایا۔

اردو زبان وادب کو پروان چڑھانے اور اسے نئے خیالات سے روشناس کرانے میں ہر عہد کے ادیبوں اور شاعروں نے عمدہ کاوشیں کیں۔ اردو افسانہ نگاری کو ترقی کی منازل طے کرانے میں ادبی تحریکوں کی کاوشیں بھی بھلانے کے قابل نہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر افسانہ نگاروں نے نہایت جاندار افسانے لکھ کر مقصدی ادب کی آبیاری کی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ شخصیات نے نہایت قلیل عرصے میں ادب کو عالمی معیار کے برابر لا کھڑا کیا۔ اس دور کے افسانہ نگاروں میں علی عباس حسینی، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، اختر انصاری، اپندر ناتھ اشک، سہیل عظیم آبادی، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، ممتاز مفتی، ابراہیم جلیس، منٹو، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، تسنیم سلیم چھتاری، ممتاز شیریں اور حسن عسکری نے متنوع موضوعات کو ادب کا وسیلہ بنایا۔ ان سب نے مختلف طرز معاشرت کو جداگانہ انداز فکر اور تخیل کی کارفرمائی سے معاشرتی، سیاسی اور سماجی حقائق بیان کیے۔ ترقی پسند تحریک کے حوالے سے وقار عظیم لکھتے ہیں:

> ''۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ ہمارے مختصر افسانوں کی زندگی کے شباب اور اس کے فنی عروج کا بہترین زمانہ ہے۔''[۳۷]

اس دور کے لکھنے والوں میں سے کرشن چندر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز رومانوی افسانے لکھ کر کیا۔ انھوں نے کشمیر کی سرزمین سے متعلق بیشتر افسانے لکھے۔ ان کے افسانوں میں سماجی حقیقت پسندی، طنز، ذات پات کا فرق، فسادات کے واقعات، عورتوں کے ساتھ ناروا سلوک اور سرمایہ داروں کے خلاف احتجاج ملتا ہے۔ کرشن چندر کا افسانوی مجموعہ 'زندگی کے موڑ پر' بہترین افسانوی مجموعہ ہے۔ کرشن چندر طنز کے ذریعے اپنی اصل بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وحدت تاثر، فنی نقطہ نظر اور زبان وبیان کے لحاظ سے 'نغمے کی موت'، 'پشاور ایکسپریس'، 'پرانے خدا'، 'ان داتا'، 'سمندر دور ہے' اور 'مہالکشمی کا پل' جیسے بہترین افسانے لکھے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں ہیئت کے لحاظ سے بھی تجربات کیے۔ مشاہدے کی گہرائی اور مقصدیت کے ذریعے سلیس زبان اور لطیف پیرائے میں اپنا مدعا پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

منٹو اردو کی تاریخ کا ایک لازوال نام ہے جس نے حقیقت نگاری کے ذریعے دنیا کے سفاک اور بے رحم چہرے سے پردہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں معصوم، لاچار اور مظلوم کرداروں کی نہایت جاندار انداز میں منظر کشی کی ہے۔ منٹو نے ماہر نباض کی طرح معاشرتی برائیوں کے محرکات کی نقاب کشائی کی ہے۔ منٹو کا اسلوب شگفتہ نہیں بلکہ حقائق کی تلخی کو سموئے بے باک انداز میں افسانے کا مقصد بیان کر دیتا ہے۔ فسادات کے واقعات پر لکھے جانے والے افسانے 'موزیل'، 'کھول دو'، 'نیا قانون'، 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' ہیں اس کے علاوہ 'پھندنے'، 'ہتک'،

'ٹیڑھی لکیر'، 'نعرہ'، 'دھواں'، 'کالی شلوار'، 'خوشیا' اور 'ٹھنڈا گوشت' جیسے کامیاب افسانے شامل ہیں۔ ان میں مصنف نے بے بس و مجبور انسانوں کی ترحم آمیز تصاویر پیش کیں۔ منٹو کے ہاں زندگی کی مثالی تصویر نہیں ملتیں بلکہ اس دور کی جیتی جاگتی، مجبور ولاچار انسان کی پریشانیوں اور بے رحم سماج کی ظلم وانیت کی بکھری داستانوں کا بیان ہے۔ منٹو افسانے کی ابتدا میں ہی تجسس، سنسنی خیزی اور انکشاف کی کیفیت پیدا کر کے قاری کی پوری توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتے ہیں اور بے جا طوالت سے گریز کرتے ہیں۔ وہ موضوع کے مطابق فضابندی تشکیل دے کر کرداروں کی زبان اور افعال سے افسانے کی بنت اس طرح کرتے ہیں کہ تمام کڑیاں ایک دوسرے سے مربوط ہو کر قاری پر باآسانی اپنا سحر دکھاتی ہیں۔ منٹو کے ہاں اختصار بیان و حدت تاثر کو مزید نکھارتا ہے۔ منٹو کی تحریر میں روانی ہے۔ انھوں نے رمز و اشارے کی بجائے سیدھے سادے انداز میں زندگی کا حقیقی رخ پیش کیا ہے۔ وہ انسانی کیفیات کا بغور مشاہدہ کر کے کردار نگاری بخوبی نبھانے کا ہنر جانتے ہیں۔ منٹو کے افسانے زندگی کی خوبصورتی اور رعنائی پیش نہیں کرتے۔ ان میں تشبیہات و استعارات کی خیالی دنیا نہیں بلکہ ان میں تلخی اور کڑواہٹ ہے۔ منٹو کے اسلوب کے حوالے سے جابر حسین لکھتے ہیں۔:

> ''منٹو نے اپنے کرداروں کے لیے دل فریب لیکن مصنوعی الفاظ نہیں گھڑے، ترکیبیں نہیں تراشیں، اصطلاحیں نہیں ایجاد کیں۔ ان کے کرداروں نے اپنے تجربات اور محسوسات کی ترجمانی کے لیے لفظوں کا فطری جامہ اختیار کیا، تاکہ ان کی روانی، ان کے بہاؤ میں کوئی فرق نہ آئے۔''[۳۸]

ممتاز شیریں نے مغربی ادب کا مطالعہ کر کے اس کے اثرات کو جدت اور انفرادیت سے بیان کیا۔ انھوں نے انسانی نفسیات کا بغور مطالعہ کر کے داخلی زندگی کی تصویر پیش کی ہے۔ 'انگڑائی'، 'کفارہ'، 'میگھ ملہار'، 'دیپک راگ' شامل ہیں۔ وہ معاشرے کی نباض ہیں۔ ان کی کہانیاں ان کے انداز فکر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ انھوں نے بیانیہ اسلوب میں افسانے لکھے جن میں روانی بیان اور جذبات واحساسات کی واضح عکاسی ملتی ہے۔

قرۃ العین حیدر عہد جدید کی نامور لکھاری ہیں جنھوں نے موضوعات اور اسلوب میں یکسانیت کی روش کو مسترد کر کے سوچ کے نئے زاویے متعین کیے۔ ان کے افسانوں میں مخصوص فکر و فن کی نشاندہی ملتی ہے۔ ان کی کہانیوں کی فضا، کرداروں کا انتخاب، واقعیت نگاری اور پلاٹ سب میں اونچے طبقے کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کے ہاں مشرقی و مغربی تہذیب کا حسین امتزاج ہے۔ ان کے افسانے مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں جن میں نظریاتی اور نفسیاتی تجزیے کیے گئے ہیں۔ انھوں نے جنگ و امن، قدیم تہذیبوں اور اساطیری عناصر کو بھی اپنے افسانوں میں سمویا ہے۔ انھوں نے روایتی انداز سے

ہٹ کرتد براور فکری تہہ داری کے مظاہر پیش کیے ہیں۔ان کے افسانوں کی خواتین عام گھریلو اور دیہاتی نہیں بلکہ تعلیم یافتہ اور اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے والی اعلیٰ طبقے کی نمائندہ ہیں۔

غلام عباس اپنے افسانوں میں متوسط طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں معاشرے کے عمومی کردار ان کے افسانوں کا محور نہیں انہوں نے 'جاڑے کی چاندنی'، 'اوورکوٹ'، 'فینسی ہیئر کٹنگ سلیون'، 'کن رس'، 'اس کی بیوی' اور 'آنندی' جیسے بہترین افسانے لکھے۔'آنندی 'معنویت کے اعتبار سے بہترین افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار طوائف کے طبقے پر معاشرتی رویوں کے دوہرے معیار کی حقیقت آشکار کرتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے حوالے سے راجندر سنگھ بیدی کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ بیدی نے افسانوں میں متنوع موضوعات کو جگہ دی ہے۔ان کے افسانوں میں عورت سے ہمدردی کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔ 'اپنے دکھ مجھے دے دو'، 'لاجونتی'، 'درشی'، 'ہولی'، 'لمبی لڑکی'، 'دیوالہ' ان کے نمایاں افسانے ہیں۔ بیدی نے اساطیری واقعات کو بھی اپنے بیشتر افسانوں میں بیان کیا ہے جن میں مختلف تہذیبوں کی اساطیری روایتوں کی عکاسی کی ہے ان میں 'میتھن'، 'یوکلپٹس'، 'ایک باپ بکاؤ ہے' اور 'لاجونتی' شامل ہیں۔'لاجونتی' میں فسادات کے حوالے سے انسانی نفسیات کی بہترین عکاسی کی گئی ہے اور بیدی کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔ بیدی موضوع کی مناسبت سے اپنا اسلوب اختیار کرتے ہیں وہ جزئیات نگاری سے کام لے کر ڈرامائی انداز میں کہانی کی فضا تشکیل دیتے ہیں ان کے ہاں طنز و مزاح بھی پایا جاتا ہے اور فلسفیانہ افکار کی آمیزش بھی ہے وہ معاشرتی رویوں پر بھرپور طنز کرتے ہیں۔ بیدی کے کردار سیدھے سادے لوگ ہیں جو اپنی زبان سے خود اظہار کرتے ہیں۔ بیدی کے کرداروں کے ناموں سے ہی ان کی صفات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے انہوں نے افسانوں میں ہندی تہذیب و تمدن اور رسوم و رواج کی بہترین عکاسی کی ہے۔ان کے ہاں عورت محبت کا منبع اور درد کا ساگر ہے۔ وہ اظہار خیال کی ترجمانی کے لیے استعارے و کنائے کا استعمال بہترین انداز میں کرتے ہیں۔ بیدی کے اسلوب کے حوالے سے گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> ''بیدی کا اسلوب پیچیدہ اور گھمبیر ہے۔ان کے کردار اکہرے یا دہرے نہیں پہلو دار ہوتے ہیں۔ان کے مرکزی کردار اکثر و بیشتر ہمہ جہتی (MULTIDIMENSIONAL) ہوتے ہیں جن کا ایک رخ واقعاتی اور دوسرا آفاقی وازلی (ARCHETYPAL) ہوتا ہے۔''[۳۹]

راجندر سنگھ بیدی اپنے افسانوں میں متوسط طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ان کے ہاں منٹو کے برعکس ٹھہراؤ ملتا ہے۔ روزمرہ زندگی کے واقعات کو اس فنی مہارت سے بیان کرتے ہیں کہ اس میں نئی آب و تاب پیدا ہو جاتی ہے۔ان کے

ہاں قدامت اور جدیدیت کا بہترین امتزاج ملتا ہے جس میں زندگی کی تلخی اور شیرینی مل کر حقیقت نگاری کی راہ متعین کرتے ہیں۔ منٹو، عصمت اور بیدی کا شمار ہم عصر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے ایک ہی عہد میں ان افسانہ نگاروں نے مختلف طبقہ فکر کے لوگوں کی زندگی کے نہاں گوشوں سے پردہ کشائی کی۔ مختلف اسلوب بیان کی بناپر ان افسانہ نگاروں نے اردو ادب میں اپنا ایک خاص مقام حاصل کیا۔ آل احمد سرور ان تینوں افسانہ نگاروں کے انداز تحریر اور موضوعات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ناول اور افسانے کا ہیرو دراصل ہیرو نہیں ہوتا۔ وہ کچھ باتوں میں عام انسانوں میں عام انسانوں سے بلند ہو تا ہے تو کچھ میں پست۔ منٹو، بیدی اور عصمت تینوں اس گر کو جانتے ہیں اگرچہ ان تینوں کا دائرہ کار الگ الگ ہے۔ منٹو بظاہر پست انسانوں کی بلندی دکھاتے ہیں۔ عصمت متوسط طبقے کی عورتوں اور لڑکیوں کے نقاب نوچ کھینچتی ہیں اور بیدی گھر اور بازار کے شور، دیوی اور بیوی کے نازک مگر اہم فرق پر زور دیتے ہیں۔ تینوں حقیقت نگار ہیں تینوں زندگی کی قاشیں صرف افقی رخ سے نہیں کاٹتے، عمودی رخ سے کاٹتے ہیں۔ [۴۰]

احمد ندیم قاسمی نے بطور افسانہ نگار، شاعر اور نقاد اردو ادب میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ انھوں نے 'ادب لطیف'، 'نقوش' اور۔۔۔ کی ادارت کے فرائض انجام دیئے اس طرح علم و ادب سے ان کا کل وقتی تعلق قائم رہا۔ فن افسانہ نگاری کے حوالے سے انہوں نے مختلف تہذیب و معاشرت کو موضوع بنایا۔ لیکن ان کی وجہ شہرت دیہات کی سادہ لوح زندگی کی بھرپور عکاسی ہے۔ ان کے افسانے دیہات کی فضا اور تہذیب و تمدن کے عکاس کی حیثیت سے خاصے اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے عہد رفتہ کے تقاضوں کے مطابق سرمایہ دارانہ نظام، معاشرتی و معاشی استحصال اور سیاسی و سماجی تناظر کو تجزیہ کر کے انھیں بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

قاسمی کے انداز میں ٹھہراؤ اور متانت ہے وہ سلیس اور شگفتہ انداز تخاطب سے قاری تک اپنا مدعا پیش کرتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی جزئیات نگاری سے کام لے کر اس طرح منظر نگاری کرتے ہیں کہ تمام کڑیاں ایک دوسرے سے مربوط ہو کر حقیقی تاثر اجاگر کرتی ہیں۔ ان کے ہاں کسی بھی واقعے کو بیان کرتے ہوئے خارجی تاثرات سے زیادہ داخلی کیفیات کا اظہار پایا جاتا ہے۔ قاسمی نے افسانوں میں مادی اور روحانی قدروں کو بہترین انداز میں یکجا کیا گیا ہے دیہات کے سادہ ماحول، مذہبی اقدار کی پیروی اور خاص طور پر پیروں فقیروں پر اعتقاد کی روش سے سادہ لوح انسانوں پر پڑنے والے

اثرات کا بخوبی نقشہ پیش کیا ہے۔ قاسمی خود بھی شاعر تھے اس لیے رومانویت کا عنصر ان کے افسانوں پر بھی غالب ہے لیکن یہ رومانویت تخیل کی کارفرمائی نہیں بلکہ حقیقت پسندی کی چاشنی لیے ہے۔

قیام پاکستان سے قبل کی لکھاریوں میں خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور دونوں سگی بہنوں نے افسانہ نگاری سے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا اسی دور میں ان دونوں بہنوں کے علاوہ قرۃ العین حیدر نے بھی نئی لکھاریوں میں اپنی جگہ بنائی۔ انہوں نے اردو ادب کو بہترین اسلوب اور متنوع موضوعات کے خزانے پیش کیے اور نئی لکھنے والیوں کے لیے سوچ کے در وا کیے۔

حوالہ جات

۱۔ ابراہیم سعد، Little Oxford English Urdu Dictionary (آکسفورڈ یونیورسٹی، پریس، ایڈیشن ۲۰۱۳، ۱۰) ص ۶۰۲

۲۔ محمد عبداللہ خان خویشگی، فرہنگ عامرہ (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، طبع اول، جون ۱۹۸۹)، ص ۱۸۸

۳۔ فیروزالدین، مولوی، فیروز اللغات، اردو جامع (نیا ایڈیشن)، (لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، چوتھی اشاعت ۲۰۱۱ء)، ص ۹۷

۴ - نورالحسن نیر، مولوی، نور اللغات (جلد اول۔ الف۔ ب) (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع سوم، ۱۹۸۹ء)، ص ۳۱۱۔

۵- Encyclopedia of Arabic literature- volume-2,1998, page 798

۶۔ Literary History Toward a Global Perspective, 2006, page 166

۷۔ Dictionary of literary terms and literary theory, 2013,page 88

۸۔ عابد علی عابد، اسلوب (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱)، ص ۴۱

۹۔ عبداللہ سید، ڈاکٹر، طیف نثر، مرتبہ ممتاز منگلوری، اشاعت دوم، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵)، ص ۲۲

۱۰۔ طاہر فاروقی، اسلوب کے بارے میں، مشمولہ قومی زبان، شمارہ ۱۰، جلد ۵۸، (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، اکتوبر ۱۹۸۷)، ص ۵۷

۱۱۔ شہاب ظفر اعظمی، اردو کے نثری اسالیب (دہلی: تخلیق کار پبلشرز، ۱۹۹۹ء)، ص ۲۲۔

۱۲۔ طاہر فاروقی، ص ۵۶

۱۳۔ آل احمد سرور، نظر اور نظریے (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۷)، ص ۴۸

۱۴۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵)، ص ۱۳

۱۵۔ شہاب ظفر اعظمی، ص ۲۷۔۲۹

۱۶۔ شمس الرحمٰن فاروقی، افسانے کی حما یت میں (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۰۶)، ص ۹۰

۱۷۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات (اسلام آباد: نیشنل بک فاونڈیشن، ۲۰۰۴)، ص ۳۸

۱۸۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ادبی تنقید اور اسلو بیا ت (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱، ص ۱۴

۱۹۔ آل احمد سرور، نظر اور نظر یے (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۷)، ص ۴۴

۲۰۔ سید وقار احمد رضوی، ڈاکٹر، ہیت اور اسلوب، مشمولہ اسلوب اور اسلوبیات کی تعبیر و روایت، ترتیب و تشکیل سیدہ محسنہ نقوی، پروفیسر، ڈاکٹر (راولپنڈی: فرحان رضا پرنٹرز، ۲۰۰۵ء) ص ۳۶۔۳۸

۲۱۔ ایضاً، ص ۴۰۔۴۲

۲۲۔ سیّد عبداللہ، ڈاکٹر، اشارات تنقید (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰)، ص ۲۵۶

۲۳۔ گوپی چند نارنگ، ص ۱۸

۲۴۔ خلیل احمد بیگ، مرزا، پروفیسر، تنقید اور اسلوبیا تی تنقید (علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء)، ص ۴۵

۲۵۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱)، ص ۳۳۳

۲۶۔ طارق سعید، اسلوبیاتی تنقید وجہی سے قرۃ العین تک (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۳)، ص ۵۰۔۵۶

۲۷۔ رام بابو سکسینہ، ص ۳۳۷

۲۸۔ فردوس انور قاضی، پروفیسر، ڈاکٹر، اردو ادب کے افسانوی اسالیب، لاہور: مکتبہ عالیہ، ص ۸۸

۲۹۔ وقار عظیم، ص ۱۴

۳۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (آغاز سے ۲۰۱۰ء تک) (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳)، ص ۵۱۲

۳۱۔ ایضاً، ص ۵۱۲

۳۲ - انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، طبع پنجم ۲۰۰۶ء، ص ۳۷۶

۳۳۔ وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، (کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۰)، ص ۳۵

۳۴۔ ایضاً، ص ۸۶

۳۵۔ www.biography.com/people/charles-dickens-9274087#synopsis

۳۶۔ قرۃ العین حیدر، مرتبہ و مقدمہ (انتخاب سجاد حیدر یلدرم، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰)، ص ۸

۳۷۔ وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، ص ۲۶

۳۸۔ شکیل الرحمن، منٹو شناسی، ترتیب و تہذیب: جابر حسین، (پٹنہ: اردو مرکز عظیم آباد، نومبر ۱۹۹۷ء) ، ص ۸

۳۹۔ گوپی چند نارنگ، ص ۴۴۱

۴۰۔ آل احمد سرور، ص ۴۸

باب دوم

سحاب قزلباش: تعارف وادبی اہمیت

سحاب قزلباش دہلی کے مشہور ادیب و شاعر اور تحت اللفظ شعر خوانی کے ماہر آغا شاعر قزلباش دہلوی کے ہاں پیدا ہوئیں۔ آغا شاعر کے ہاں تین بیٹوں کے بعد بیٹی کے آنے سے ان کا گھرانہ جیسے مکمل ہو گیا ہو۔ آپ ۱۹۳۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئیں۔ آغا شاعر نے اپنی والدہ مرحومہ کے نام پر اپنی بیٹی کا نام اکبر سلطانہ رکھا۔ گھر میں سب انہیں سلطانہ کے نام سے بلاتے۔[1] اکبر سلطانہ سے بڑے تین بھائی آغا آفتاب قزلباش، آغا سرخوش قزلباش اور آغا اقبال قزلباش تھے۔ آغا شاعر نے اپنی بیٹی کی پرورش بہت ناز و نعم سے کی۔ سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے سلطانہ گھر بھر کی لاڈلی تھیں۔ آغا شاعر جہاں کسی محفل میں جاتے تو سلطانہ کو بھی ساتھ لے جاتے۔ سلطانہ کو اپنے والد کے ساتھ گزارے لمحات کسی خواب کی طرح سے یاد آتے۔ وہ ابھی بہت کم عمر تھیں جب ان کے والد کا انتقال ہوا اس لیے ان کی ایک موہوم سی تصویر سلطانہ کے ذہن میں رہی۔ آغا شاعر کو شعر و ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت بھی انھوں نے اسی علمی فضا میں کی۔ ان کے ہاں ادبی محفلوں کا بہ کثرت اہتمام کیا جاتا۔ گھر کے ادبی ماحول اور بیٹھک پر ادبی محفلوں کے انعقاد نے آغا شاعر کے بچوں کا ذہنی میلان ادب کی طرف موڑ دیا۔ آغا شاعر قزلباش کی وفات کے بعد ان کے منجھلے بیٹے آغا سرخوش قزلباش نے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ادارت کے فرائض انجام دیے۔ انھوں نے دہلی سے 'چمنستان' رسالہ نکالا۔ گھر کے ادبی ماحول کے اثرات سلطانہ کی شخصیت پر بھی اثر انداز ہوئے اور یوں انھوں نے شاعری اور نثر دونوں میں طبع آزمائی کی۔ سلطانہ کا ادبی رجحان بچپن ہی سے گھر کے دیگر بچوں کی نسبت زیادہ رہا اور نہایت کم عمری میں ہی انھوں نے شاعری اور افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا اور ادبی حوالوں سے اپنے آپ کو سحاب قزلباش کے نام سے متعارف کروایا۔ سحاب کی زندگی پر ان کے والد کے گہرے اثرات کے باعث مناسب ہو گا کہ ایک نظر اُن کے والد کی زندگی پر ڈال لی جائے۔

آغا شاعر قزلباش

آغا شاعر قزلباش داغ دہلوی کے شاگرد خاص اور قدیم تہذیب کے علمبردار تھے۔ ان کا اصل نام ظفر علی قزلباش تھا۔ اردو شاعری میں آغا شاعر قزلباش کے نام سے خود کو متعارف کروایا۔ آپ ۱۸۷۱ء کو ہندوستان کے شہر دہلی میں

پیدا ہوئے۔[۲] آپ کا تعلق ایران کے معزز خاندان قزلباش سے تھا۔[۳] آباؤ اجداد نے ایران سے دہلی آکر مستقل سکونت اختیار کی اور یہاں پیشہ سپہ گری اور سرکاری ملازمتوں کو اختیا کیا۔ آغا شاعر قزلباش کے والد گرامی پیشے کے اعتبار سے متہم تھے۔[۴] آپ کے خاندان کا شمار دلی کے عمائدین میں کیا جاتا تھا۔ آغا شاعر نے کسی مدرسے سے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ ان کا رجحان ہمیشہ سے ادب کی طرف رہا اور شعر وادب سے گہرے لگاؤ کی بنا پر فصیح الملک شاعر داغ دہلوی کے تلامذہ خاص میں شمار ہوئے۔ آغا شاعر کا ذہنی میلان علم وادب سے تھا اس لیے انھوں نے ملازمت کی بجائے بحیثیت ادیب اور شاعر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

آغا شاعر قزلباش مغل تمدن کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ جوانی میں بہت حسین تھے۔ غلافی آنکھیں ہمیشہ مخمور نظر آتیں۔ گول چہرہ اور خوبصورت نقوش کے حامل تھے اور ہمیشہ سر پر عمامہ باندھتے۔ آپ نے بحیثیت شاعر، ادیب، ڈرامہ نگار، صحافی اور معروف ناول نگار متنوع جہات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ آپ تحت اللفظ با آواز بلند اتنے دلنشیں انداز میں پڑھتے کہ بعد میں محفل پر کسی اور شاعر کا زور نہ چلتا۔[۵]

آغا شاعر کی شاعری اپنی معنویت اور اسلوب کی بنا پر زبان زد عام ہو جاتی۔ ان کی شاعری پر داغ دہلوی کے اسلوب کا اس خاص حد تک اثر تھا کہ بعض لوگوں کو آغا شاعر کا کلام پڑھ کر داغ دہلوی کے کلام کا مغالطہ رہتا۔ شاہد احمد دہلوی اور گوپی ناتھ امن سنگھ نے اپنے مضامین میں انہی تاثرات کا ذکر کیا ہے جس میں وہ ایک عرصے تک آغا شاعر قزلباش کے کلام کو داغ دہلوی کا کلام سمجھ کر محظوظ ہوتے رہے۔ بعد ازاں یہ عقدہ کھلا کہ یہ کلام داغ کے شاگرد خاص کا ہے جن پر داغ کا تتبع ہے۔[۶] آغا شاعر کا کلام سنہ وار مرتب نہیں ہوا بلکہ ردیف وار ہے۔ ان کا پہلا دیوان 'تیر و نشتر ہے'۔ انھوں نے ڈرامے اور ناول بھی لکھے۔ ان کے ڈراموں میں 'حور جنت' بہت مقبول ہوا، ناولوں میں 'نقلی تاجدار'، 'انور ورضیہ'، 'لیلیٰ دمشق'، 'ارمان'، 'ہیرے کی کان' اور 'قتل بے نظیر' ہیں جن میں 'قتل بے نظیر' بے حد مقبول ہوا۔

سر عبدالقادر کی زیر ادارت 'مخزن' رسالے میں دیگر نامور شعرائے کرام اور مصنفین کے ساتھ آغا شاعر کا نام نامی بھی فہرست میں شامل ہوا جنھوں نے اپنے مضامین اور شاعرانہ کلام کے ذریعے قارئین کے دل موہ لیے۔ ان کا کلام ہر خاص وعام کی زبان پر دہرایا جاتا۔ شاعری کی طرح نثر میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ دہلی تہذیب و معاشرت کی زبان وبیان، الفاظ اور محاورے بخوبی نبھانے کا ہنر جانتے تھے اور ان میں بقدر ضرورت دیگر مقامی زبانوں کے الفاظ کی آمیزش سے تحریر کو خاص معنویت بخشتے۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی سبق آموز کہانیاں لکھیں۔ ان کی بچوں پر تصانیف 'آویزہ

گوش' اور 'دامن مریم' ہیں۔ ان کی تصانیف اپنی معنویت کے لحاظ سے خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ 'دامن مریم' ۱۹۲۴ء۔ ۱۹۳۰ء تک شامل نصاب رہی۔[۷] جمیل احمد صدیقی آغا شاعر کی نثر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''وہ جس پایہ کی نظم بہ آسانی لکھتے تھے اسی طرح نثر کے شہ پارے ان کے قلم سے بے ساختہ نکلتے تھے، دلی کی بولی، محاورے سے سجی سجائی نثر اور قلعہ معلیٰ کی دھلی دھلائی آسان زبان لکھنے پر انہیں بڑی قدرت تھی۔ جب چاہتے ہندی اور سنسکرت کے الفاظ نگینوں کی طرح فقروں میں جڑ دیتے تھے۔ ان کی تحریریں ہندی اردو، ہندوستان جھگڑے کے زمانے میں بے حد مقبول اور مستند مانی جاتی تھیں۔''[۸]

آغا شاعر قزلباش متنوع جہات کے مالک شخص تھے۔ انھوں نے اپنے دلی کے آبائی گھر بمقام ابراہیم علی خاں کشمیری دروازے سے ہفتہ وار 'آصف الاخبار' نکالا جو موضوع کے لحاظ سے ادبی نوعیت کا حامل تھا جس میں نظم وغزل اور مضامین شامل ہوتے۔ اس کے علاوہ دلی سے ایک ماہ نامہ 'پنجه نگارین' بھی نکالا جس میں نامور شعرائے کرام کا کلام چھپتا تھا۔ اسی طرح ۱۹۱۹ء میں ریاست جھالا واڑ راجپوتانہ سے ادبی ماہنامہ 'آفتاب' بھی جاری کیا۔ ماہنامہ 'آفتاب' آغا شاعر قزلباش نے اپنے بڑے بیٹے آغا آفتاب قزلباش کے نام پر نکالا تھا جس میں نئے شعرا کو روشناس کرانے کا موقع ملا۔ جوش ملیح آبادی کو متعارف کروانے اور مصور جذبات کا خطاب دینے کا سہرا بھی آغا شاعر کو ہی جاتا ہے۔ بعد ازاں انھوں نے ریاست جھالا واڑ سے قطع تعلق کر کے لاہور سے ماہنامہ 'آفتاب' کا اجرا کیا اور دیوان شرر کو اس کا نائب مدیر مقرر کیا۔ اپنی معنویت کے اعتبار سے ماہنامہ 'آفتاب'، 'مخزن' رسالے کا ہم عصر تھا۔ آغا شاعر کی ہندوستان بھر میں شہرت کے باعث ان کے رسالے 'آفتاب' میں لکھنے والوں میں اس عہد کے مشاہیر شامل تھے جن میں خواجہ حسن نظامی، سجاد حیدر یلدرم، راشد الخیری، علامہ نظم طباطبائی، علامہ کیفی، اکبر الٰہ آبادی، ریاض خیر آبادی، مہاراجہ کشن پرشاد، رضا علی وحشت اور مہاراج بہادر برق دہلوی کے نام شامل ہیں۔ ماہنامہ 'آفتاب' دو حصوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ ایک حصے میں نظم اور دوسرے میں نثر ہوتی۔ آغا شاعر قزلباش کو فارسی زبان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ انھوں نے مشہور زمانہ تصنیف 'رباعیات عمرخیام' کا اردو منظوم ترجمہ 'خمکدہ خیام' کے نام سے کیا۔ 'خمکدہ خیام' زبان واسلوب کے لحاظ سے ایک بہترین ترجمہ ہے۔ بعد ازاں 'رباعیات عمرخیام' کے تراجم مختلف زبانوں میں ہوئے۔ شاہد احمد دہلوی اسے باقی سب ترجموں سے زیادہ معیاری تصور کرتے ہیں۔ اس میں ساڑھے چھ سو رباعیاں شامل ہیں جن میں رومانیت، غزلیت، فنی پختگی اور اسلوب کی دلکشی پائی جاتی ہے۔[۹] آغا شاعر ترجمے کو بے کیف نہ ہونے دیتے۔

دیگر اصناف ادب کے علاوہ آغا شاعر قزلباش کی شخصیت کا ایک پہلو تصوف حبِ الٰہی کا جذبہ ہے جو ان کے اندر موجزن رہا، اس وجہ سے ان کی نسبت مختلف کرامات کی مثالیں بھی اس زمانے میں زبان زدعام تھیں اور ان کے مریدوں کی ایک کثیر تعداد بھی تھی جو ان سے خاص محبت وعقیدت رکھتے تھے اور اپنی آنکھوں سے ان کی کرامات کے چند ایک واقعات بھی دیکھ چکے تھے۔[۹] تصوف کے لحاظ سے ان کا ایک خوبصورت شعر ان کے حبِ الٰہی کا واضح ثبوت پیش کرتا ہے۔

عبد و معبود میں کیا خوب ہی گزری شاعر

میں خطاوار رہا، یار خطا پوش رہا "

آغا شاعر قزلباش نے شاعری، ناول وافسانہ نگاری، اخباروں اور ادبی رسالوں کے اجراء کیے اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے رباعیات خیام اور قرآن پاک کے منظوم ترجمے جیسے قابل قدر کارنامے سرانجام دیے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا تنقیدی مضمون 'اردو کا دورجدید مغربی روشنی میں ' بہت اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے وضع اصطلاحات اور جملوں کی طوالت کی بجائے سادگی، اختصار اور جامع انداز کو اظہار نگارش کا ذریعہ بنانے کی طرف توجہ دلائی۔[۱۲]

آغا شاعر نے شاعری میں مناظر قدرت، تاریخی و معاشرتی واقعات اور تہذیبی روایات کو موضوع بنایا۔ ان کے انداز بیان کی تشکیل گہرے مشاہدے، تخیل اور احساس وجذبے کے زیر اثر ہوئی ہے۔ جس کی بدولت ان کی نظموں میں حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ آغا شاعر محاورے کی بندش، وسیع النظری، الفاظ کی بناوٹ، تخیل، اسلوب کی چاشنی اور قادر الکلامی کے لحاظ سے داغ کے سچے پیرو کار تھے۔ ان میں خودداری اور سپاہیانہ آن بان تھی۔ مذہب کی طرف گہرا جھکاؤ تھا جس نے ان کی شخصیت میں متانت اور درویشی کی صفات پیدا کر دیں۔ انہیں دلی سے بے حد لگاؤ تھا۔ دلی کی تہذیب و معاشرت کے وہ امین تھے اس لیے دلی کی زبوں حالی پر ان کا دل کھڑ ھتا تھا۔ اس قدر نرم دل تھے کہ دلی کے حالات اور اجڑی دلی کو دیکھ کر ان کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ انھوں نے مرثیہ نگاری میں بھی اپنے فنی جوہر دکھائے اور جو ندرتیں پیدا کیں ان میں زبان کی چاشنی اور ذرخیزی ذہن کے کمالات کا ادراک ہوتا ہے۔ ان کے مرثیوں کا مجموعہ ڈاکٹر صفدر حسین نے 'زاد آخرت' کے نام سے شائع کیا جس میں ۱۴ مرثیے شامل ہیں۔[۱۳] آغا شاعر کو عمر کے آخری حصے میں متعدد بیماریوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو ان کا انتقال ہوا۔[۱۴]

سحاب قزلباش کی تعلیم و تربیت

آغا شاعر کی وفات کے وقت سحاب کی عمر تقریباً دس برس تھی۔ والد کی وفات کے بعد بھائیوں اور والدہ نے سحاب کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری احسن انداز سے نبھائی۔ سحاب نے دلی کے عربی سکول سے تعلیم کا آغاز کیا بعد میں کوئن میری سکول دلی سے ہائی سکول تک کی تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے اردو فاضل کا امتحان پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پاس کیا۔[15] علم و ادب ان کے گھرانے کا لازمی جزو تھا کم عمری میں ہی سحاب نے اردو ادب کی بہترین کتابیں پڑھ لی تھیں۔ انہیں شاعری و نثر کے ساتھ ساتھ مصوری اور موسیقی سے بھی بے حد لگاؤ تھا۔ کلاسیکی موسیقی کا انہیں خاص درک حاصل تھا۔ ریڈیو سروس میں ملازمت کے دوران انور بائی آگرے والی سے لے کر استاد فیاض خان تک کو سننے کا موقع ملا۔

سحاب کو کتب بینی سے لگاؤ ہمیشہ سے رہا۔ اس دور کے نامور ادبی رسالے 'عصمت'، 'بنات'، 'جوہر نسواں'، 'ادب لطیف'، 'چمنستان'، 'آج کل'، 'ہمایوں' اور 'ساقی' جیسے شاہکار بصد شوق پڑھتیں، ان میں سے بعض رسالے پڑھنے کی اجازت نہ ہوتی انہیں وہ چھپا چھپا کر پڑھتیں۔ ان رسالوں کو پڑھ کے ان میں بھی افسانے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ سحاب اور ان کے بھائیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں ان کی والدہ کا کلیدی کردار رہا ہے۔ اسی حوالے سے شاہد احمد دہلوی بیگم آغا قزلباش کی کاوشوں پر ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

> ''بیگم آغا ہی نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کچھ اس سلیقے سے کی کہ آج بفضلہ تینوں لڑکے برسر روزگار اور خوشحال ہیں۔ سب سے چھوٹی لڑکی اپنے گھر بار کی ہے۔ شعر گوئی سب کو ورثے میں ملی ہے مگر سب سے زیادہ اسی بچی کو جو سحاب تخلص کرتی ہے، اپنے نامی گرامی باپ کی طرح نثر بھی خوب لکھتی ہے ماشا اللہ۔ ان چاروں بھائی بہنوں سے مل کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ دلی کا روائتی حسن اخلاق، بڑوں کا ادب چھوٹوں کا لحاظ، خوش خو، خوش کلام، خوش صفات، یہ عطیہ ہے بیگم آغا کا۔''[16]

شاعری کا آغاز

سحاب قزلباش نے بحیثیت شاعرہ بہت کم عمری میں اپنی صلاحیتوں کو منوایا۔ ابتدا میں انھوں نے مشاعروں میں شرکت نہیں کی اس کی وجہ اس زمانے میں پردے کا خاص اہتمام رکھا جاتا۔ سحاب نے اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے تحریک آزادی کے جلسوں میں اپنے تازہ کلام سنا کر بے پناہ داد وصول کیں۔ وہ خوش شکل اور خوش گلو تھیں اور یوں خود

اعتمادی نے ان کی شخصیت میں مزید نکھار پیدا کیا۔ وطن عزیز کے عظیم رہنماؤں کے سامنے اس قدر اطمینان سے اپنا کلام پیش کرتیں کہ سامعین داد دیئے بغیر نہ رہ پاتے۔

ایک مرتبہ جامعہ ملیہ کے یوم تاسیس کے منعقدہ جلسے میں بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح، وزیر تعلیم راج گوپال اچاریہ اور سردار عبدالرب نشتر کی سربراہی میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے ہندوستان میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی روداد سنا کر سامعین کے دلوں کو گرمایا۔ اس موقع پر سحاب قزلباش کو بھی اپنے اشعار سنانے کا موقع دیا گیا۔ ان چوٹی کے اکابرین کی موجودگی میں سحاب نے نہایت خود اعتمادی سے اپنی نظم پیش کی۔ ان کے ایک شعر نے سب پر رقت طاری کردی۔ وہ شعر یہ ہے

ہمارے پھول، ہمارا چمن، ہماری بہار
ہمیں کو جا نہیں ملتی ہے آشیانے کو [۱۷]

پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز

سحاب نے اپنے والد کی وفات کے بعد ریڈیو سروس میں نعت کے پروگرام سے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔ اس وقت وہ آٹھویں جماعت کی طالبہ تھیں اور ان کی عمر تقریباً گیارہ سال تھی۔ سحاب کی ریڈیو سروس سے واقفیت اپنے والد کی وساطت سے ہوئی تھی۔ ان کے والد آغا شاعر قزلباش خود بھی ریڈیو سے وابستہ رہے۔ پہلی مرتبہ سحاب اپنے والد اور ان کے دوست خواجہ حسن نظامی کے ساتھ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن گئیں جہاں ان کے والد نے ریڈیو پر تقریر کی اور یہ ان کی زندگی کی آخری تقریر ثابت ہوئی۔

سحاب کے والد نے اپنی بیٹی کی پرورش بیٹا سمجھ کر کی۔ وہ خود اپنی بیٹی کو ادبی محفلوں میں لے جاتے سحاب کی عمر تقریباً دس برس تھی جب انھوں نے ادبی محفلوں میں جانا شروع کر دیا تھا۔ البتہ ریڈیو سروس میں کام کا آغاز انھوں نے والد کی وفات کے بعد کیا۔ اس زمانے میں خواتین کا گھر سے باہر نکلنا اور خاص طور پر ریڈیو اسٹیشن جا کر ملازمت کرنا انتہائی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ سحاب ریڈیو پر خواتین کے پروگرام سن کر بہت پرجوش تھیں۔ اس لیے بصد اصرار وہاں کام کرنے کی اجازت چاہی۔ سحاب کے بھائیوں کے لیے یہ کسی طور گوارا نہ تھا کہ وہ اپنی چھوٹی اور اکلوتی بہن سے ریڈیو سروس میں ملازمت کروائیں لیکن سحاب کے بار بار اصرار کے بعد کام کی اجازت ملی۔ سحاب نے اس غرض کے لیے آغا شاعر کے دیرینہ دوست جوش سے درخواست کی کہ وہ اس کے بھائیوں سے بات کر کے نوکری کے لیے راضی کریں اور یوں جوش اور

ن۔م۔ راشد نے سحاب کے بڑے بھائی آغا آفتاب قزلباش سے بمشکل اجازت دلوائی۔ پہلے پہل یہ اجازت بچوں کے پروگرام کے لیے دی گئی بعد میں سحاب نے بھائی صاحب (آغا آفتاب قزلباش) سے مختلف پروگراموں میں کام کرنے کی ضد کی اور یوں ان کے کام کا دورانیہ آہستہ آہستہ بڑھتا گیا اور شام پانچ بجے سے آٹھ بجے تک ہو گیا۔ ان پروگراموں میں نعت رسول مقبول، بچوں کا پروگرام، فوجی بھائیوں کا پروگرام، پھر عورتوں کا پروگرام اور بطور نشرکار کی ذمہ داری سنبھالی اور احسن انداز سے ان پروگراموں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں، آواز کے جادو اور الفاظ کی مٹھاس سے ناظرین کے دلوں کو موہ لیا۔[18]

اخلاق احمد دہلوی کے مطابق سحاب کی آواز میں ہندوستان کی نامور گلوکارہ لتا منگیشکر کی آواز سی شیرینی پائی جاتی ہے۔[19]

دوسری جنگ عظیم کے موقع پر سحاب کو ریڈیو پر فوجیوں کے پروگرام کرنے کی پیش کش ہوئی تو سحاب نے فوراً قبول کر لی۔ اس وقت پروگرام کے انچارج محمود نظامی صاحب تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ سکول کی بچی کو پروگرام کی ذمہ داری سونپی جا رہی ہے تو وہ کترائے لیکن سحاب کی آواز سننے کے بعد آمادہ ہو گئے۔ سحاب فوجی بھائیوں کے پروگرام کا آغاز چوڑیوں کی کھنک سے کرتیں اور پھر فوجیوں کو اپنی دلکش آواز اور دلفریب انداز سے وطن اور ہم وطنوں سے محبت وعقیدت کے جذبہ کی یاد دلاتیں۔[20] جیسے جیسے فوجی بھائیوں کے پروگرام کی مقبولیت بڑھتی گئی۔ سحاب پر والدہ کی طرف سے لگائی جانے والی پابندیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ سادہ لباس اور اس کے ساتھ موٹی ململ کا دوپٹہ لینا لازم ہو گیا۔ بناؤ سنگھار کرنے کی اجازت بالکل نہ تھی۔ فوجی بھائیوں کے پروگرام کے لیے چوڑیاں پہننا ضروری ہوتا اس پر بھی والدہ کی خاص نظر رہتی اور بھری کلائیوں میں سے چوڑیاں اتر کر صرف چھ چھ چوڑیاں پہننے کی بہ مشکل اجازت دیتیں۔[21] زاہدہ حنا اس پروگرام کے حوالے سے لکھتی ہیں۔:

> ''ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی، کانوں میں رس گھولتی ہوئی ایک آواز جو پل چھن کے لیے ان کا رشتہ اپنے گھر سے، اپنے بچھڑے ہوئے رشتوں سے جوڑ دیتی۔ لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں سرسراتی ہوئی ہوا۔ بلائیں لیتی ہوئی ماؤں کے انگلیوں کے چٹخنے کی آواز اور محبوباؤں کی چوڑیوں کی چھنک۔ اس پروگرام میں وہ سب کچھ سن سکتے تھے۔ بھولے بسرے گیت، ولی دکنی سے آغا شاعر قزلباش کے شعر اور کبیر اور میرا بائی کے دوہے، پنجابی کے ٹپے۔''[22]

بچپن میں لکھا گیا افسانوں کا مجموعہ 'بدلیاں'، ان کے نوخیز جذبوں کی ترجمانی ہے جس میں معصوم کلیوں کی مہک اور پاکیزہ احساسات کا عکس نظر آتا ہے سحاب کہتی ہیں اب جب کبھی ان افسانوں کو پڑھتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ کیا لکھتی تھی اور اب سب سے چھپاتی ہوں۔

سحاب نے آل انڈیا ریڈیو سروس میں جب کام کیا اس وقت یہ آفس انڈر بل روڈ پر واقع ایک پرانی کوٹھی میں تھا جس کی دیواریں چھوٹی اور سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں دیواروں کے ساتھ پام کے تناور درخت تھے عمارت کے اندر کمروں میں پردے لگے ہوئے تھے جو دیواروں پر موجود سوراخ سے آواز کے تاثر کو کھینچ لیتے۔ بعد میں پارلیمنٹ روڈ پر نئے ریڈیو اسٹیشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس نئی عمارت پر نئے طرز کے مطابق شیشے لگائے گئے اور انجینئرز نے نشرکاروں کو فیڈر چلانے کی تربیت بھی دی۔ سحاب کو بھی بطور نشرکار فرائض دیئے گئے جو ان کے لیے ریڈیو سروس میں کام کے لحاظ سے بہت بڑی کامیابی تھی۔ اس وقت تربیت کے فرائض زیڈ۔ اے بخاری سرانجام دیتے تھے۔ وہ کردار میں جان پیدا کرنے کی سعی کرتے اور اپنے تمام نشرکاروں کو اس بات کی تاکید کرتے کہ ہوا کے دوش پر پہنچنے والی آواز اپنے انداز، طرز تخاطب، الفاظ کے چناؤ اور لہجے کی چاشنی لیے سننے والے کے دل میں اتر جائے اور اسے دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر کے مسرت و بصیرت کا وسیلہ بن کر پروگرام کا اصل حق ادا کرے۔ [۲۳]

سحاب قزلباش نے ریڈیو پر ڈراموں میں بھی حصہ لیا اس زمانے میں ریڈیو پروگرام اور ڈرامے براہ راست پیش کیے جاتے تھے ان میں ڈرامہ 'انارکلی' کا کردار سحاب کو تفویض کیا گیا اور اس کی مشق کروانے کی ذمہ داری زیڈ۔ اے۔ بخاری نے لے لی۔ ڈرامے میں انارکلی کی آواز کا حقیقی تاثر پیدا کرنے کے لیے بار بار مشق کروائی گئی اور زندان میں سے قیدی کی آواز کا تاثر پیدا کرنے کے لیے سحاب کو میز کے نیچے بیٹھ کر آواز کا حقیقی تاثر پیدا کرنا تھا۔ اس کاوش میں تین جملوں میں قید و بند، بھوک پیاس اور نقاہت کا تاثر دینے کے لیے کئی گھنٹوں کی محنت شامہ عمل میں لائی تب جا کر زیڈ-اے۔ بخاری کی سند قبولیت حاصل ہوئی۔ [۲۴]

انارکلی کے علاوہ انھوں نے شوکت تھانوی کے ڈرامہ 'اسپٹنک' میں بھی آواز کا جادو جگایا اور ہواؤں کے سنگ آواز کے زیر و بم کے ذریعے خلاؤں کی پرواز کا تاثر پیدا کیا۔ 'اسپٹنک' میں بیٹی ہوائی جہاز میں اپنے منگیتر کے ساتھ بیٹھ کر خلاؤں کی سیر کرتی ہے اور وہیں سے اپنے والد صاحب سے شادی کی اجازت طلب کرتی ہے۔ اس ڈرامے میں شوکت تھانوی نے چچا کا کردار ادا کیا اور والد کے کردار کے لیے خود زیڈ۔ اے بخاری نے فرائض ادا کیے۔ ڈرامے میں صوتی تاثرات کی بہترین عکاسی کے لیے گلاس کی مدد سے آواز میں حقیقی عنصر پیدا کیا گیا۔ [۲۵]

سحاب کی آواز آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو پاکستان کراچی کی بہترین آوازوں میں شمار ہوتی تھی اس حوالے سے ساقی فاروقی لکھتے ہیں:

> ''ٹیلی ویژن کے زمانے میں پروان چڑھنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ریڈیو والے زمانے میں چار آوازیں قیامت تھیں۔ سنتوش رسل، سحاب قزلباش، ایس ایم سلیم اور عبد الماجد اور یہ تمام ڈراموں کی جان تھیں۔''[۲۶]

اسی طرح بی بی سی لندن میں کام کرتے ہوئے بھی سحاب نے اپنی آواز کا جادو جگایا۔ بی بی سی لندن اردو سروس سے بچوں کا مشہور پروگرام 'شاہین کلب' پر مزاح انداز کی وجہ سے بہت مقبول ہوا۔ اسے بام عروج پر پہنچانے میں ان کی ٹیم کی کاوشیں قابل داد رہیں۔ اس پروگرام کی خاص بات یہ تھی کہ بچوں کا پروگرام ہونے کے باوجود اس میں کوئی بچہ شامل پروگرام نہ تھا بلکہ بچوں کے انداز میں مکالمے سدھو بھائی بخوبی نبھاتے۔ اس پروگرام میں سحاب کو بھی اپنی صلاحیتیں پیش کرنے کا موقع ملا۔ اس پروگرام کی کاسٹ میں سدھو بھائی، سحاب قزلباش، پروین مرزا، شاہدہ احمد و دیگر شامل تھے جنھوں نے اپنے شگفتہ اسلوب اور پر مزاح باتوں سے سامعین کے دل موہ لیے۔ سحاب نے مشہور ظرافت نگار وسیم صدیقی کے ساتھ شاہین کلب میں کام کا آغاز کیا۔ وسیم صدیقی بہترین مزاح نگار تھے جنھوں نے لطافت و ظرافت اور فی البدیع انداز بیان سے شاہین کلب کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کیا۔ وسیم صدیقی کا کنٹریکٹ ختم ہونے کے بعد بی بی سی اردو کے نامور صحافی اور نشر کار رضا علی عابدی کو پروگرام میں سدھو بھائی کا کردار لکھنے کے فرائض دیئے گئے۔

رضا علی عابدی سحاب کو بچپن سے جانتے تھے۔ انھوں نے آل انڈیا ریڈیو پر سحاب قزلباش کے بچوں کے پروگرام ذوق و شوق سے سن رکھے تھے۔ اس لیے ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ آل انڈیا ریڈیو پر بچوں کے پروگرام میں سحاب کی مقبولیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اس پروگرام میں ایک لڑکی حصہ لیا کرتی تھی جس کی باتیں اور آواز مجھے اچھی لگتی تھی۔ اس کی باتوں میں بلا کی شوخی تھی اور جہاں تک مجھے یاد ہے وہ گاتی بھی تھی۔''[۲۷]

سحاب قزلباش کی صلاحیتوں کو پہچانتے ہوئے انھوں نے پروگرام میں مزاحیہ کردار ادا کرنے کے لیے دیئے اور ساتھ ہی پروگرام میں بچوں کے لیے نغمے بھی گانے کی ذمہ داری بھی سونپی۔ رضا علی عابدی صاحب نے اپنی کتاب 'ریڈیو کے دن' میں شاہین کلب کے ڈراموں کا احوال رقم کیا ہے جس میں سدھو بھائی اور سحاب قزلباش عرف سلطانہ باجی دلچسپ مکالمات اور صوتی تاثرات ڈرامے میں حقیقت نگاری کی ایسی چاشنی بھر دیتے ہیں کہ فی البدیع انداز بیان سن کر ہنسی پر قابو

پانا دشوار ہو جاتا۔ شاہین کلب کے ایک ڈرامے میں سلطانہ باجی اخبار کے مطالعے میں مشغول تھیں کہ سدھو بھائی چوہے کا تعاقب کرتے اسی کمرے میں بندوق لے کر داخل ہوتے ہیں سلطانہ باجی کے استفسار پر وجہ بیان کرتے ہیں تو سلطانہ باجی چوہے سے خوفزدہ ہو کر پنکھے سے لٹک جاتی ہیں اور سدھو بھائی اس چوہے کو مارنے کے لیے بندوق کا غلط نشانہ باندھ بیٹھتے ہیں جو چوہے کی بجائے چھت پر لگے پنکھے کو جا لگتا ہے اور سلطانہ باجی پنکھے کے ساتھ چوہے کے اوپر آ کر گرتی ہیں اور یوں چوہا شکار ہوتا ہے۔[۲۸]

اس کے علاوہ انھوں نے انگریزی ٹی وی ڈراموں میں بھی اپنی صلاحیتوں کو آزمایا۔ ان ڈراموں کے نام یہ ہیں۔

Uncle Tulip
Play For Today
The Changes

ان ڈراموں میں سحاب نے مختلف کردار ادا کیے ہیں۔ ڈرامہ The Changes میں سحاب نے دادی اماں کا کردار ادا کیا۔ ڈرامے کی کہانی سکھوں اور انگریزوں کے گرد احاطہ کرتی ہے۔[۲۹]

سحاب نے متنوع جہات میں اپنی صلاحیتوں کو آزمایا۔ انہیں برطانیہ میں قیام کے دوران روزگار کے میدان میں بھی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ لندن میں سحاب کو روزگار کے حوالے سے بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بی بی سی میں کام کے دوران انہیں ان کی قابلیت کے مطابق نوکری نہ مل سکی۔ انھوں نے لندن میں پاکستانی ہائی کمیشن میں ملازمت کی اس کے علاوہ بی بی سی کے آڈیئنس ریسرچ کے شعبہ میں استقبالیہ کے فرائض بھی انجام دیئے بھی۔ انھوں نے بطور پروف ریڈر روزنامہ جنگ لندن میں بھی کام کیا اور نہایت خوش دلی سے ان سب ذمہ داریوں کو نبھایا۔[۳۰]

تحریک آزادی کی فعال رکن

سحاب نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ تحریک آزادی کے جلسوں میں شریک ہوتیں اور فنڈز جمع کرنے کے لیے دوسری لڑکیوں کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں اور کناٹ پیلس میں باقی لڑکیوں کے ساتھ مل کر مسلم لیگ کے جھنڈے بیچا کرتیں۔ مسلمان خواتین رہنما تحریک آزادی کے جلسوں میں اپنے خیالات کا اظہار کر کے ان میں علیحدہ وطن حاصل کرنے کا جوش و ولولہ بڑھاتیں اور انہیں ایک پرچم کے سائے تلے متحد رہنے پر آمادہ کرتیں۔ اس کاوش میں بیگم شاہنواز، بیگم لیاقت علی خاں، بیگم اکرام اللہ اور بیگم افروز و دیگر قابل قدر شخصیات پیش پیش رہیں۔ آغا شاعر قزلباش کو دلی شہر سے بے پناہ محبت و عقیدت تھی وہ کسی سے بھی دلی کے حوالے سے کوئی غلط بات برداشت نہیں

کرتے تھے بلکہ فوراً سیخ پا ہو جاتے یہی محبت و عقیدت سحاب کے خاندان کو ورثے میں ملی۔ سحاب کی والدہ نے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اپنے آبائی گھر قصرِ شاعر کو دل میں بسائے رکھا۔ سحاب قیام پاکستان کے لیے سرگرم عمل بھی تھیں لیکن دلی سے دور ہونے کا تصور بھی ان کے لیے جان لیوا تھا۔ انہیں یہ پریشانی لاحق ہوتی کہ اگر دلی پاکستان میں نہ ہوا تو اپنا گھر، دوست احباب، محلہ سب کیسے چھوڑ سکے گی۔ قیام پاکستان کے بعد سحاب کے لیے دہلی میں قصرِ شاعر میں رہنا مشکل ہو گیا۔ فسادات کے نتیجے میں ایک خوف اور بے یقینی کی کیفیت تھی کہ کسی بھی وقت ان کے گھروں میں لوٹ مار اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہو سکتا ہے ایسے حالات میں سحاب نے اپنی والدہ کو راضی کر کے مہاجرین کو دلی سے کراچی لے جانے والے آخری جہاز میں سوار ہو کر اپنے خوابوں کی سرزمین پاکستان پہ قدم رکھا اور اپنی رہنما خواتین کو دیکھ کر فرط مسرت سے لبریز جذبوں سے وطن عزیز میں آزادی کی سانس لی۔

قیام پاکستان کے بعد سحاب کا خاندان لاہور منتقل ہو گیا۔ لاہور میں منتقلی کے لیے رہائش کا انتظام اور گھر کی الاٹمنٹ کے لیے مصنفہ بیگم اختر ریاض الدین کے شوہر ریاض نے ماڈل ٹاؤن لاہور بلڈنگ کی ایک منزل D-41 الاٹ کر دی جو تین کمروں پر مشتمل تھی۔ سحاب اور ان کی والدہ نے اس گھر میں سکونت اختیار کی۔ ان کے بھائی آغا سرخوش قزلباش ہجرت کے وقت اپنی والدہ اور بہن کے ساتھ نہ آئے بلکہ دلی میں کچھ عرصہ قیام کیا اور وہیں جائیداد اونے پونے داموں فروخت کی۔ قیام پاکستان کے بعد جب آغا سرخوش قزلباش پاکستان آئے تو دلی کا گھر، دفتر اور ہندوستانی پبلشرز کے دفتر کے بدلے صرف چھ ہزار روپے لائے اور پھر نعمان اور ممتاز حسن کی ضمانت پر ایلفنسٹن اسٹریٹ پر 'کتاب محل' کا آغاز کیا۔ 'کتاب محل' کتابوں کی دکان تھی جس کی عمارت کی اصل قیمت پینتیس ہزار روپے بنتی تھی۔ انھوں نے ضمانت پر یہ عمارت حاصل کر کے اپنے کاروبار کا آغاز کیا اور ساتھ ہی ادبی رسالہ بھی نکالا۔ آغا سرخوش ہندوستان سے رسالہ 'چمنستان' نکالتے تھے۔ بعد ازاں پاکستان سے انھوں نے رسالہ 'نورنگ' کا اجراء کیا۔[۳] پاکستان آتے ہی سحاب کے لیے معاش کا ذریعہ ختم ہو گیا تھا تب انھوں نے ریڈیو اسٹیشن ڈائریکٹر فرید صاحب کو فون کر کے نوکری کی درخواست کی اور نوکری ملنے پر اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ لاہور چلی گئیں۔

سحاب کے منجھلے بھائی آغا سرخوش بھی کراچی منتقل تھے اور ان سے چھوٹے بھائی جو کہ سحاب سے عمر میں بڑے تھے۔ آغا اقبال قزلباش، ان کا خاندان راولپنڈی منتقل ہو گیا اسی عرصے میں سحاب کی شادی بھی کراچی کر دی گئی تھی جب کہ ان کی والدہ محترمہ اکیلی لاہور کے مکان میں رہیں۔ اسی زمانے میں ریڈیو پاکستان لاہور کے صدیقی صاحب نے رہائش کے انتظامات کے لیے الاٹمنٹ کے دفتر میں سحاب کی والدہ کے تین کمروں پر مشتمل اکیلے گھر میں رہنے کو جواز بنا کر

گھر حاصل کرنے کوشش کی اور وجہ بیان کی کہ وہ (بڑی بی) اپنے بیٹوں کے پاس کراچی جا کر رہائش اختیار کر سکتی ہیں۔ان کا یہاں رہنا بعید از قیاس ہے۔ تب سحاب کی والدہ صاحبہ نے فیض احمد فیض کو فون کر کے ان حالات سے باخبر کیا اور آغا آفتاب قزلباش جوان دنوں کام کے سلسلے میں کراچی گئے تھے انہیں اس صورتحال سے مطلع کرنے کا کہا لیکن فیض صاحب نے اپنی کوششوں سے بحالیات کمشنر کے آفس رابطہ کر کے آغا شاعر کے مقام و مرتبے کا احساس دلایا اور ان کے لاہور میں قیام کو یقینی اور حتمی بنانے کی ذمہ داری لی اور ساتھ ہی انھوں نے مبلغ ۲۰۰ روپے کا چیک خود بطور کرایہ ادا کیا۔ سحاب کے بھائی آغا اقبال قزلباش جواں عمری میں ہی وفات پا گئے تھے۔سحاب کی والدہ کے لیے نوجوان بیٹے کی جدائی کا دکھ نہایت تکلیف دہ تھا۔اس موقعے پر فیض احمد فیض نے خاندان کے فرد کی طرح تعزیت کی اور بڑی بی کی ڈھارس بندھائی۔[۳۲]

ازدواجی زندگی

سحاب کی زندگی نے تب ایک نیا موڑ لیا ان کی شادی گل یوسف سے کر دی گئی۔ گل یوسف نیول آفیسر تھے۔ شادی کے بعد سحاب کراچی منتقل ہو گئیں ان کا گھر کراچی میں جمشید روڈ پر واقع تھا۔ شادی کے کچھ سال بعد ان کے ہاں پھول سے بیٹے کی پیدائش ہوئی جس کا نام انھوں نے نبیل ریاض رکھا۔[۳۳]

قیام پاکستان سے قبل گل یوسف آغا سرخوش سے دہلی میں مل چکے تھے۔گل یوسف بمبئی کے رہنے والے تھے۔ شکل و صورت کے لحاظ سے واجبی سے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد جب وہ لوگ کراچی منتقل ہوئے اور رشتے کی بات چلی تو آغا آفتاب قزلباش کو شکل و صورت کے لحاظ سے اپنی بہن کے لیے یہ رشتہ موزوں نہیں لگا لیکن اماں نے سمجھا کر منا لیا اور شکل و صورت کی بجائے ذریعہ معاش کو اہمیت دی گئی۔ شادی کے کنٹریکٹ میں یہ طے ہوا تھا کہ سحاب شادی کے بعد ریڈیو سروس میں ملازمت نہیں کریں گی۔ شادی کے بعد سحاب کو اندازہ ہوا کہ ریڈیو سروس سے ان کی دلی وابستگی قائم ہو چکی ہے وہ ان کی زندگی کا حسین باب تھا جسے بھلانا ممکن نہیں۔ وہ خوابوں میں بھی براڈکاسٹ کرتی رہتیں۔ اسی عرصے میں ریڈیو پاکستان کراچی میں نئے کام کرنے والے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی اور خاص طور پر ماہر لوگوں کی جو ایک مرتبہ پھر ریڈیو سروس پاکستان میں زندگی کی روح پھونک سکیں اور اسے آل انڈیا ریڈیو سروس کی طرح جدید خطوط پر استوار کر سکیں کیونکہ اس وقت سب سے اہم مسئلہ معاشی لحاظ سے درپیش تھا۔ ریڈیو اسٹیشن کے لیے کوئی عمارت نہ تھی اور نہ ہی ٹرانسمیٹرز موجود تھے۔تب زیڈ-اے-بخاری نے چودھری محمد علی کی خدمت میں خط لکھ کر اس ضرورت کی طرف توجہ دلائی۔ یوں ان کی منظوری سے امریکہ سے ٹرانسمیٹر خرید کر لگائے گئے اور ریڈیو اسٹیشن کے لیے عمارت اس وقت کے

کراچی کے کلکٹر ہاشم رضا صاحب نے دلوائی۔ اس سے قبل یہ عمارت ڈسٹرکٹ بورڈ کے نام تھی۔[۳۴] اور اس کے ساتھ ہی ریڈیو سروس میں پہلے سے کام کرنے والوں کو دوبارہ اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے آمادہ کرنا تھا۔ اس کام کے لیے ایک دن نظامی صاحب سحاب کے گھر پہنچ گئے اور انہیں زبردستی ریڈیو اسٹیشن پر کام کرنے کے لیے قائل کر کے اپنے ساتھ لے گئے کہ ریڈیو اسٹیشن کے اسٹوڈیو کے قیام اور دیگر مسائل کے ساتھ اناؤنسمنٹ کے لیے بھی مسئلہ ہے اس لیے چل کر یہ ذمہ داری خود ہی سنبھالو۔ تب سحاب نظامی صاحب کو انکار نہ کر سکیں اور اپنے خاوند کے نام ایک پرچے پر جانے کی وجہ لکھ کر نظامی صاحب کے ساتھ ریڈیو اسٹیشن چلی گئیں اور دوبارہ سے کام کا آغاز لیا۔[۳۵]

سحاب نے بیشتر ممالک کے سفر کیے ہیں۔ انھوں نے اپنا پہلا سفر شادی کے بعد ملک برطانیہ کا کیا۔ سحاب علاج کی غرض سے لندن گئی تھیں۔ سحاب نے اپنے سفر نامے میں لندن جانے کی وجہ لکھی ہے لیکن کس بیماری کا علاج کروانے کی غرض سے گئیں تھیں اس بارے ذکر نہیں کیا۔ چونکہ سحاب نے زندگی کا بیشتر حصہ لندن میں گزارا اس لیے ان کی نوعمری اور پاکستان میں قیام کے حالات کے بارے میں بہت کم معلومات حاصل ہو سکی ہیں ان کے بارے زیادہ تر معلومات ان کی اپنی تصانیف سے ملی ہیں۔ لندن میں قیام کے عرصے میں ان کے بیٹے کی ولادت 'میری ایبٹ ہسپتال st.Marrie Abbot Hospital میں ہوئی[۳۶]۔ نبیل کی پیدائش کے بعد سحاب نے بی بی سی لندن میں ملازمت اختیار کر لی۔ بی بی سی لندن میں کام کرنا ان کی زندگی کی بہت بڑی خواہش تھی اور پھر لندن جیسے شہر میں اپنے پاس موجود قلیل رقم کے ساتھ زیادہ عرصہ تک گزارا کرنا بھی مشکل تھا۔ سحاب کے شوہر کی خواہش تھی کہ سحاب لندن میں مستقل سکونت اختیار کر لے لیکن دیار غیر میں اکیلی عورت اپنے شیر خوار بچے کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لیے کچھ عرصہ لندن میں قیام کے بعد واپس پاکستان آ گئیں۔ لیکن عائلی زندگی کے مسائل نے ان کی مشکلات میں اضافہ کر دیا تھا۔ نبیل کے والد کا نارواا اور تضحیک آمیز سلوک سحاب کی مشکلات میں اضافہ کر دیتا وہ اپنی ذمہ داریوں کو بوجھ سمجھتا تھا۔ ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی بنا پر لڑائی جھگڑے معمول کا حصہ بن گئے۔ ایسے حالات میں گل یوسف نے امریکن ایمبیسی کی نوکری چھوڑ کر نائیجیریا میں نوکری کرنے کا فیصلہ سنا دیا۔ وہ بیوی بچوں کو ساتھ لے جانے پر راضی نہیں تھے۔ یوں ایک مرتبہ پھر انہیں تنہا یہ ذمہ داریاں نبھانی تھیں۔ ان دنوں ریڈیو زاہدان کے لیے ایک اناؤنسر کی ضرورت تھی تب سحاب نے بھی ضد میں آ کر ریڈیو زاہدان کے چھ سال کے کنٹریکٹ پر دستخط کر دیئے اور بیٹے نبیل ریاض، والدہ اور ایک نوکر کو ساتھ لے کر ایران چلی گئیں۔ ایران پہنچ کر انہیں مزید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سحاب نے بچپن سے ہی فارسی شعر و ادب کو پڑھا اور سنا اس لیے ایران کی سرزمین ان شعرا کی نسبت سے انہیں بہت عزیز تھی۔ لیکن زاہدان اسٹیشن پر انہیں مایوسی ہوئی جب اطلاع کے باوجود انہیں لینے کے لیے ریڈیو دفتر

سے کوئی بھی نہ آیا۔ مجبوراً ٹیکسی کر کے ریڈیو اسٹیشن تک وہ خود گئیں۔ ریڈیو اسٹیشن پہنچ کر انہیں گھر کی چابیاں دے دی گئیں اسٹیشن کے ساتھ ہی ان کی رہائش کے لیے گھر کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ گھر کافی بڑا تھا جہاں گرمیوں اور سردیوں کے لیے الگ الگ کمرے بنائے گئے تھے۔ صحن میں فوارا بھی تھا جس کے ساتھ ہی پانی کا پمپ لگا ہوا تھا۔ وہاں سب سے عجیب بات سحاب کے لیے گھر میں بیت الخلا کا نہ ہونا تھی۔

ریڈیو زاہدان میں کام کے آغاز میں ہی سحاب کو اندازہ ہو گیا کہ انہیں بہت زیادہ کام کرنا پڑے گا۔ لائبریری میں پہلے سے ریکارڈ شدہ پروگرام بہت ہی کم تھے۔ پاکستان سے جاتے ہوئے سحاب اپنے ساتھ ریکارڈ کیے ہوئے کچھ پروگرام بھی ساتھ لے گئی تھیں لیکن یہ ضرورت پوری کرنے کے لیے ناکافی تھے۔ اس لیے انھوں نے بہت سے ریکارڈ تیار کر کے ایک مکمل لائبریری بنائی تاکہ کسی ناگہانی صورتحال میں پہلے سے تیار شدہ پروگرام کو چلا دیا جائے۔ آفس کا تمام کام فارسی زبان میں ہوتا۔ سحاب کے لیے فارسی زبان میں لکھنا پڑھنا قدرے مشکل تھا بچپن میں وہ فارسی زبان اپنے گھر میں سنتی رہی تھیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو سروس میں آدھے گھنٹے کا پروگرام فارسی زبان میں پیش کرتی تھیں لیکن یہاں آ کر انہیں تمام پروگرام فارسی میں ہی لکھنے تھے۔ کچھ دنوں میں ہی انھوں نے فارسی سیکھ کر مہارت حاصل کر لی۔ بول چال کی زبان ہونے کی وجہ سے انہیں فارسی سیکھنے میں کافی آسانی رہی۔ ایران میں کام کے دوران انہیں صبح سات بجے سے لے کر شام سات بجے تک ڈیوٹی دینی ہوتی۔ دوپہر میں دو گھنٹے کا وقفہ ملتا جس میں گھر آ کر وہ اپنی ذمہ داریاں نبھاتی۔ ریڈیو زاہدان میں کام کرتے ہوئے تنہا تمام ذمہ داریوں کو سنبھالنا مشکل تھا۔ ان کی والدہ کچھ عرصہ ان کے ساتھ رہ کر واپس وطن لوٹ گئیں اب صرف سحاب اور ان کا بیٹا نبیل ہی تھے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ذمہ داریوں سے کبھی غافل نہ ہوئیں۔ نبیل کی تعلیم و تربیت اور دیکھ بھال پر کبھی لاپروائی نہ برتی۔ بچے کی دیکھ بھال کے لیے ملازمہ بھی موجود رہتی۔ کام کے دوران نبیل کو آفس میں بٹھا کے کاغذ قلم تھما دیتیں اور خود اپنے کام مکمل کرتی رہتیں۔ شام میں خود اپنے بیٹے کو انگریزی کی تعلیم دیتیں۔ دن رات لگاتار محنت سے سحاب کی صحت پر اثرات مرتب ہونے لگے اور انہیں کھانسی کی شکایت رہنے لگی گھر سے دوری کا جاں گزیں احساس بھی پریشانی میں مبتلا کیے رکھتا تب ان کے لیے ایران میں مزید رہنا دشوار ہو گیا۔ آخر کار انھوں نے ملازمت سے مستعفی ہونے کے لیے درخواست دی تو انہیں اس شرط پر نوکری چھوڑنے کی اجازت ملی کہ آپ پاکستان سے اپنے متبادل کے طور پر کسی کو راضی کریں۔ سحاب کے لیے یہ سب کرنا مشکل تھا تب انھوں نے اپنی میڈیکل رپورٹ پیش کر کے انہیں اپنے مسئلے سے آگاہ کیا کہ کنویں کے پانی سے گلہ خراب رہنے لگا ہے۔ شاید یہاں کی آب و ہوا راس نہیں

آئی۔اب پاکستان جاکر اپنا علاج کروانا چاہتی ہوں۔ طبیعت بہتر ہوئی تو واپس لوٹ آؤں گی۔ایران سے جانے کے لیے سحاب نے پاکستان ایمبیسی خط لکھ کر اپنے مسائل تفصیل سے بیان کیے اور ان سے مدد کی درخواست کی۔

قیام کے دوران ہی سحاب کو اندازہ ہوا کہ غیر ملکیوں کے لیے ایرانیوں کے اصول کافی سخت ہیں-اس کا تجربہ پہلی مرتبہ غیر ملکیوں کی مدد کرتے ہوئے انہیں اپنے گھر لانے پہ ہوا۔ایک دن سحاب کام کی غرض سے بینک گئیں تو انہیں ایک آسٹریلوی ڈاکٹر اپنے خاندان کے ہمراہ ملا۔ وہ ایران میں اجنبی تھے انہیں کسی اچھے ہوٹل کی ضرورت تھی- سحاب ازراہ ہمدردی انہیں اپنے گھر لے آئیں تاکہ کچھ وقت آرام کر کے اور تازہ دم ہو کے وہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو سکیں۔ دفتر پہنچنے پر سحاب کو اطلاع ملی کہ ابھی انہیں سی آئی ڈی آفس جانا ہوگا۔ سی آئی ڈی آفس پہنچ کر انھوں نے اپنا موقف پیش کر کے معذرت نامہ لکھ دیا تب جاکر انہیں واپس دفتر جانے کی اجازت ملی اور ان مہمانوں کو بھی ان کے گھر سے کہیں اور بھیج دیا گیا۔ سحاب کے لیے یہ سب صورتحال کافی مختلف تھی۔اس واقعے کے بعد انھوں نے محتاط رویہ اپنالیا۔تب انہیں محسوس ہوا کہ اتنی پابندیوں میں رہنا ان کے لیے بہت اذیت ناک ہے۔ وہاں کے ماحول اور معاشرت سے دل اچاٹ ہوا تو واپس پاکستان آنے کے لیے کمربستہ ہو گئیں-انھوں نے چھ سال کا معاہدہ کیا تھا لیکن تین سال بمشکل وہ یہ نوکری کر سکیں۔انہیں ایران سے جانے کی اجازت بھی اس صورت میں ملی کہ وہ دو ماہ کے پروگرام بنا کر دے جائیں اور ان دو ماہ کے پیشگی پروگرام بنا کے دینے پر کوئی اجرت نہیں ملنی تھی۔ سحاب ہر صورت پاکستان واپس جانا چاہتی تھیں -اس لیے انھوں نے ایرانی گورنمنٹ کے قوانین کے مطابق انہیں دو ماہ کے پروگرام بنا کر دیئے۔ایک مختلف ماحول میں رہنا اور وہاں کی طرز زندگی کو اپنانا بہت مشکل ہوتا ہے ایران میں قیام کے عرصے میں وہاں کی طرز معاشرت کے مطابق خود کو ڈھالنا بھی بہت مشکل امر تھا۔ سحاب پاکستان میں پردے کا اہتمام نہیں رکھتی تھیں-ایران پہنچتے ہی انہیں ملنے والے تحائف میں چادر بھی تھی۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے معمور ملازمہ نے بتایا کہ یہاں پردے کا خاص خیال رکھا جاتا ہے آپ بھی چادر لے کر باہر جایا کریں۔

سحاب اپنے بیٹے کو ایک مطمئن زندگی دینا چاہتی تھیں تاکہ ان کا بیٹا اپنی زندگی میں باپ کے پیار کی کمی کو محسوس نہ کرے۔ گل یوسف اور سحاب کے درمیان نبیل ہی اس رشتے کو باقی رکھنے کا ذریعہ تھا۔ایران میں قیام کے عرصے میں نبیل اپنے والد کی کمی کو بہت محسوس کرتا۔ گل یوسف بھی اپنے خطوط میں بیٹے کی غیر موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے واپسی کا تقاضا کرتے۔تب سحاب نے نوکری کو عائلی زندگی پر ترجیح نہ دیتے ہوئے چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ نائیجیریا کی حکومت اپنی پالیسی کے مطابق سال میں ایک ماہ کے لیے بیرون ملک سے تعلق رکھنے والے ملازمین کے خاندان کو رہنے کی اجازت دیتی

تھی۔ ایران سے واپسی کے بعد سحاب اپنے شوہر کے پاس مستقل طور پر رہنے کے لیے نائیجیریا چلی گئیں۔ وہاں سحاب کو مسز گل کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ نائیجیریا میں ان کی زندگی ایک مکمل گھریلو عورت کی سی رہی۔ وہ سارا دن خود کو گھر کے کاموں میں مصروف رکھتیں۔ ان کے بیٹے نبیل نے ہنسی خوشی یہ لمحات بسر کیے۔ لیکن سحاب اور ان کے شوہر کے درمیان یہ رفاقت زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ روزانہ کے جھگڑے ان کی زندگی کا معمول بن چکے تھے۔ گل یوسف کی زندگی ایک باوفا شوہر کی زندگی نہ تھی بلکہ ان کے نزدیک سحاب کی اہمیت صرف ان کے بچے کی ماں کی حیثیت کی حد تک تھی۔ ان کی زندگی میں بیوی کے علاوہ دوسری عورتوں کے لیے جگہ تھی۔ ان حالات سے دلبرداشتہ ہو کر سحاب واپس لوٹ آئیں اور ان دونوں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کا انجام طلاق کی صورت میں ہوا۔[۳۷]

سحاب نے ساری زندگی اپنے بیٹے کی کفالت اور پرورش کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا اور دیار غیر میں نامساعد حالات کا خوش اسلوبی سے سامنا کیا۔ سحاب نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مختلف ممالک میں بسر کیا۔ لندن میں ان کا قیام بی بی سی لندن کے حوالے سے قائم ہوا جو کہ تاعمر قائم رہا۔ شوہر سے علیحدگی کے بعد کچھ عرصہ وہ پاکستان میں رہیں اور اس کے بعد انھوں نے باقی عمر لندن میں گزار دی۔ وہ جنگ لندن میں کچھ عرصہ کالم بھی لکھتی رہیں۔ اس کے علاوہ حلقہ ارباب ذوق سے بھی منسلک رہیں۔ انہیں لندن سے رسالہ نکالنے کا بہت شوق تھا۔ اس معاملے میں وہ اپنے دوست ادیبوں کی مدد کی متمنی رہیں۔ اس بات کا ذکر انھوں نے عصمت چغتائی سے بھی کیا اور ان کی معاونت طلب کی جس کے لیے ان کے ذہن کے دریچوں میں ایک مکمل منصوبہ تیار تھا لیکن مناسب ذریعہ معاش نہ ہونے اور وسائل کی کمی کے باعث وہ تنہا یہ کار خیر انجام نہیں دے سکتی تھیں۔[۳۸]

سحاب نے آپ بیتی نہیں لکھی لیکن ان کے تحریریں ان کی بکھری اور منتشر سوچوں کی عکاس ہیں۔ ان کا بچپن، جوانی، بڑھاپا سب ان میں پنہاں ہے وہ ماضی کے جھروکوں سے نکل ہی نہیں سکیں۔ ساری زندگی ماضی اور حال کو مربوط کر کے ماضی کو حال میں لانے کے لیے جیسے سرگرداں رہی ہوں۔ گزرے لمحات اور بچھڑے دوستوں اور رشتوں کو جوڑنے کی سعی کرتی رہیں۔ سحاب قزلباش انسان دوست شخصیت تھیں۔ ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا جن میں ادبی وغیر ادبی شخصیات کی طویل فہرست شامل رہی۔ وہ دوستوں کی دوست تھیں۔ وہ ادبی محفلوں میں اپنی شرکت کو لازمی بنانے کی سعی کرتیں۔ سحاب نے زندگی کا بیشتر حصہ اکیلے اور تلاش معاش میں سرگرداں گزارا۔ اس مصروفیت کی زندگی میں ان کے دوست احباب اور ادب سے لگاؤ ہی ان کی زندگی کو کارواں اور انہیں مستعد رکھنے کا وسیلہ تھا۔ سحاب کا گھر اور دل ان کے دوستوں کے لیے ہر وقت کھلا ہوتا جہاں کسی دوست کو ضرورت پڑی وہ فوراً خیریت پوچھنے پہنچ گئیں۔ دوستوں

کو خوش رکھنے اور ماضی کی بھول بھلیوں سے نکال کر زندہ و تابندہ لمحات میں جینے کا حوصلہ مہیا کرتی تھیں۔ انھوں نے جس تنہائی کا کرب سہا تھا۔ اس کرب کے عکس کو اپنے عزیزوں اور دوستوں پر پڑتا نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ فیض صاحب ہوں یا ن۔ م۔ راشد جو بھی ماضی کی گرفت میں آتا فوراً انہیں حال کے پر مزاح ماحول میں لانے کی سعی کرتیں۔ ہمدرد اس قدر کہ کسی کو ذرا سی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ زاہدہ حنا ان کی اچھی دوستوں میں سے ایک ہیں وہ ایک واقعہ بیان کرتی ہیں کہ ایک بار ان کا مالک مکان اپنا مکان فروخت کرنا چاہتا تھا اور انہیں رہائش کے لیے نئی جگہ ڈھونڈنے میں مشکل درپیش آرہی تھی۔ اس بات کا تذکرہ انھوں نے اپنی دوست مرحومہ فیروزہ جعفر سے کیا۔ انھوں نے لندن میں سحاب کو جب یہ بات بتائی تو سحاب نے فوراً کراچی میں موجود اپنے فلیٹ میں رہائش اختیار کرنے کے لیے بہت اصرار کیا۔[۳۹] اسی طرح ان کی خوش خلقی اور مہمان نوازی کا ایک واقعہ رضا علی عابدی صاحب نے بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''نور جہاں ایک بار اپنے سازندوں کے لاؤ لشکر کے ساتھ لندن آئیں تو سحاب نے مارے محبت کے ان سب کو اپنے چھوٹے سے تنگ مکان میں ٹھہرا لیا۔ سازندے خدا جانے کب کے بھوکے تھے، ان کی خاطر داری کرتے کرتے سحاب کی جو درگت بنی، ہم ہی جانتے ہیں۔''[۴۰]

سحاب نے زندگی کی مشکلات کو کبھی خود پر حاوی نہ ہونے دیا۔ انھوں نے تنہا کفالت کی ذمہ داری سنبھالی تاکہ اپنے بیٹے کو ایک روشن مستقبل دے سکیں۔ ان کی کاوشوں کا ذکر آصف جیلانی نے اپنے ایک خط میں ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''چہرے پر ہر لمحہ مسکان سجائے اور محبتوں اور ہمدردیوں سے بھرپور سحاب نے نوعمری ہی سے کتنے قلبی حادثے جھیلے تھے۔ ان کی ازدواجی زندگی کتنی دل شکستہ رہی تھی اور پھر برطانیہ میں روزگار کے میدان میں انہیں کتنی اذیتیں اور مصیبتیں اٹھانی پڑیں لیکن انھوں نے ان سب مصائب، مشکلات، پریشانیوں اور نامساعد حالات اور بیماریوں کے محاصرے اور ان کے چومکھی پتھراؤ کا نہایت جی داری اور حوصلہ مندی سے مقابلہ کیا اور اپنا لوہا منوایا۔''[۴۱]

تصانیف

سحاب کو وراثت میں شعر و ادب کا ذوق جمال حاصل ہوا۔ انھوں نے شاعری اور نثر دونوں میں فنی کمالات دکھائے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'بدلیاں' کم عمری میں شائع ہوا۔ بدلیاں کے افسانے 'چمنستان' رسالے کی زینت بھی بنے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف طبقہ فکر سے منسلک اشخاص کے خاکوں پر مشتمل دو کتابیں 'میرا کوئی ماضی نہیں'

اور 'روشن چہرے' لکھیں جن میں ان کی ماضی کی یادیں رقم ہیں۔ اس کے علاوہ شاعری سے بھی انہیں خاصا لگاؤ رہا۔ وہ مشاعروں میں شعر پڑھ کر محفل کا مزہ لوٹ لیتیں۔ ان کی اوائل عمری کا ایک شعر خاص طور پر زبان زد عام ہے۔

بجھ رہے ہیں چراغ دیر و حرم

دل جلاؤ کہ روشنی کم ہے [۴۲]

سحاب خاکوں کا ایک اور مجموعہ لکھنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ اس بات کا تذکرہ انھوں نے روشن چہرے میں لکھا ہے قرین از قیاس ہے کہ اگر تیسرا مجموعہ چھپتا تو اس میں پاکستان اور ہندوستان کے نامور گلوکاروں اور فلمی ستاروں کو موضوع تحریر بناتیں۔ [۴۳]

سحاب نے ادبی سرگرمیوں میں شرکت کے لیے مختلف ممالک کے سفر کیے۔ انھوں نے لندن، امریکہ، کینیڈا اور بھارت کے مشاعروں میں شرکت کر کے اپنے کلام سے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا۔ ان کا شعری مجموعہ 'لفظوں کے پیرہن' ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ سحاب نے ریڈیو سروس میں ملازمت کے دوران مختلف ممالک کے سفر کیے۔ ریڈیو زاہدان اور بی بی سی لندن میں بھی ملازمت کرتی رہیں اور پھر انہی مناظر و واقعات کو مد نظر رکھ کر انھوں نے سفر نامہ 'ملکوں ملکوں شہروں شہروں' لکھا۔

سحاب کو مختلف زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ انہیں اردو، انگریزی، فارسی بنگالی، پشتو اور فرانسیسی زبان پر عبور حاصل تھا۔ وہ سماجی سرگرمیوں میں بھی ہمیشہ پیش پیش رہیں۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو اور عورتوں کی انجمن 'بزم حریم' میں فعال کردار ادا کیا اور بطور سیکریٹری اپنی خدمات انجام دیں۔ [۴۴]

وفات

سحاب نے اپنی پوری زندگی اپنے بیٹے کے لیے وقف کر دی اور گل یوسف سے طلاق کے بعد دوبارہ شادی نہیں کی۔ سحاب کو جوانی میں ہی متعدد بیماریوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جوانی میں سحاب بہت خوبصورت اور متناسب جسم کی حامل تھیں لیکن شادی کے بعد ان کے وزن میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ان کا وجود نہ صرف ان کے اپنے لیے بلکہ بیٹے اور بہو کے لیے بھی بوجھ بن گیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں لندن کونسل منتقل کر دیا گیا۔ انھوں نے زندگی کے آخری ایام لندن کے شمال میں ولزڈن گرین علاقے کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں تنہا گزارے۔ ریٹائرمنٹ

کے بعد انھیں لندن کونسل کی جانب سے پینشن اور رہائش کی سہولت ملی جہاں وہ اپنی یادوں کے سہارے زندگی کے آخری لمحات تک رہیں۔ ان کا بیٹا اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ کچھ دیر کے لیے آتے اور خیر وعافیت دریافت کر کے چلے جاتے۔[۴۵] ان کی منہ بولی بیٹی تسنیم شیرازی بھی باقاعدگی سے جا کر ان کی دیکھ بھال کرتیں۔ عمر کے آخری ایام میں سحاب کو متعدد بیماریوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ۲۶ جولائی ۲۰۰۶ء کو طبیعیت زیادہ خراب ہونے پر انہیں پیڈنگٹن اسپتال لے جایا گیا وہیں انھوں نے وفات پائی۔ انہیں واٹ فورڈ کے قصبہ میں ہیری پورٹر فلم اسٹوڈیو سے ملحق قبرستان میں دفن کیا گیا۔[۴۶]

حوالہ جات

۱۔ سلطانہ مہر، آج کی شاعرات (کراچی: محراب ادب، ۱۹۷۳ء)، ص ۱۲۰

۲۔ نظر حسین زیدی، شخصیات و مباحث (کراچی: مکتبہ مسعود، ۱۹۸۳ء)، ص ۱۷

۳۔ مجتبیٰ حسین (مرتبہ) آغا شاعر حیات وشاعری (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۷۰ء)، ص ۳۸

۴۔ فیضان حسن سید، آغا شاعر قزلباش دہلوی شخصیت اور شاعر، (دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۵ء، ص ۱۲

۵۔ مجتبیٰ حسین (مرتبہ)، ص ۲۳۸

۶۔ ایضاً، ص ۳۶

۷۔ ایضاً، ص ۵۲

۸۔ ایضاً، ۵۲

۹۔ ایضاً، ص ۱۲

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۴

۱۱۔ فیضان حسن سید، ص ۶۳

۱۲۔ نظر حسین زیدی، ص ۱۳

۱۳۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو رباعی (فنی وتاریخی ارتقاء)(لاہور: مکتبہ عالیہ ۲۰۰۱ء)، ص ۱۲۷

۱۴۔ مجتبیٰ حسین (مرتبہ)، ص ۲۶۵

۱۵۔ سلطانہ مہر، ص ۱۲۰

۱۶۔ مجتبیٰ حسین (مرتبہ)، ۱۶

۱۷۔ سلطانہ مہر، ص ۱۲۰

۱۸۔ سحاب قزلباش،میرا کوئی ماضی نہیں، کراچی: فضلی سنز،۱۹۹۵ء، ص۳۳۔

۱۹۔ اخلاق احمد دہلوی،یادوں کا سفر(لاہور: مکتبہ عالیہ،۱۹۹۱)، ص۲۱۷

۲۰۔ سحاب قزلباش،میرا کوئی ماضی نہیں،۵۱۱

۲۱۔ سحاب،روشن چہرے (کراچی: اشارات پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء)، ص۵۳

۲۲۔ زاہدہ حنا، سحاب قزلباش یادوں کی برسات،روزنامہ جنگ،نرم گرم16- 8 - 2004، ص۱۔۲

۲۳۔ سحاب قزلباش،میرا کوئی ماضی نہیں، ص۹۹

۲۴۔ ایضاً، ص۹۹

۲۵۔ ایضاً، ص۱۰۲

۲۶۔ ساقی فاروقی،آپ بیتی/ پاپ بیتی(کراچی: اکادمی بازیافت،۲۰۰۹ء)، ص۶۸

۲۷۔ رضا علی عابدی، برقی مراسلہ،راقم الحروف۔تاریخ 6.8.2017

۲۸۔ رضا علی عابدی،ریڈیو کے دن (لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۱)، ص۶۳

۲۹۔ https://www.imdb.com/name/nm0702685/bio

۳۰۔ راشد اشرف (مرتبہ)، اردو کے نادر و کمیاب شخصی خاکے، جلداول،(کراچی: اٹلانٹس پبلی کیشنز، ۲۰۱۶)، ص۵۱۶۔۵۱۷

۳۱۔ سحاب قزلباش، میرا کوئی ماضی نہیں، ص۶۱

۳۲۔ ایضاً، ص۵۱۔۵۲

۳۳۔ شفیق بریلوی، تذکرہ شاعرات پاکستان،(کراچی: مکتبہ خاتون پاکستان،۱۹۶۱ء)، ص۱۳۱

۳۴۔ ذوالفقار علی بخاری، سید، سرگزشت(اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع اول،۲۰۱۱)، ص۳۱۰

۳۵۔ سحاب قزلباش،میرا کوئی ماضی نہیں، ص۱۱۶

۳۶۔ سحاب قزلباش،ملکوں ملکوں شہروں شہروں،(کراچی: دانیال پبلی کیشنز،۲۰۰۲)،ص۲۹

۳۷۔ سحاب قزلباش،روشن چہرے،ص۴۷

۳۸۔ سحاب قزلباش،میرا کوئی ماضی نہیں،ص۱۲۱۔۱۲۲

۳۹۔ زاہدہ حنا،ص۳

۴۰۔ رضا علی عابدی، برقی مراسلہ،راقم الحروف، 6.8.2018

۴۱۔ راشد اشرف(مرتبہ)،۵۱۷

۴۲۔ سحاب قزلباش،لفظوں کے پیرہن،(کراچی:اشارات پبلی کیشنز، جنوری ۲۰۰۲)،ص۱۱

۴۳۔ سحاب قزلباش،روشن چہرے،ص۱۰

۴۴۔ سلطانہ مہر،ص۱۲۲

۴۵۔ سحاب قزلباش،روشن چہرے،ص۱۰

۴۶۔ راشد اشرف(مرتبہ)،۵۱۷

باب سوم

سحاب قزلباش کی افسانوی و غیر افسانوی تصانیف کا اسلوبی مطالعہ

سحاب کی نثری تصنیفات کو درجہ بندی کے لحاظ سے افسانوی اور غیر افسانوی نظر میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ افسانوی نثر میں ان کا واحد افسانوی مجموعہ 'بدلیاں' ہے جبکہ غیر افسانوی نثر میں ان کی خاکوں پر مشتمل دو تصانیف 'میرا کوئی ماضی نہیں' اور 'روشن چہرے' ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک سفر نامہ 'ملکوں ملکوں شہروں شہروں' بھی لکھا۔ سحاب لفظ کے معانی 'بادل، ابر، گھٹا اور ستاروں کا گچھا' کے ہیں[1] اور افسانوی مجموعہ ان کے نام کی معنویت لیے ہے۔ 'بدلیاں' کی اشاعت ہندوستانی پبلشرز دلی سے مئی ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ اس میں کل سولہ افسانے شامل ہیں۔ کتاب کی طباعت سے قبل یہ افسانے دلی کے مشہور رسالے 'چمنستان' میں چھپتے رہے تھے۔ چمنستان کی ادارت کے فرائض سحاب قزلباش کے منجھلے بھائی آغا سرخوش قزلباش انجام دیتے تھے۔ بعد ازاں ان افسانوں کو ایک مکمل کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ 'بدلیاں' کل سولہ افسانوں پر مشتمل مجموعہ ہے ان افسانوں کے موضوعات ان کی عمر کے رجحانات اور خوابوں کے عکاس ہیں۔ ان افسانوں میں نوخیز جذبوں کی ترجمانی ہے جس میں معصوم کلیوں کی مہک اور پاکیزہ احساسات کا عکس نظر آتا ہے۔ ان افسانوں میں بھوک و افلاس، غریبی و امیری، محبت و رقابت، سماجی مسائل اور معاشرتی برائیوں کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ صنف نازک کے خیالات اور احساسات ان کا خاص موضوع رہا بطور صنف نازک ان احساسات کی عکاسی احسن انداز میں کی گئی ہے۔ ان افسانوں کے عنوان یہ ہیں۔

۱۔ بدلیاں ۲۔ آہوں کے بادل ۳۔ دھواں ۴۔ آگ جل رہی ہے

۵۔ کس قدر رنگین ہے راہ محبت کا فریب ۶۔ نین ہین کو راہ دکھاؤ

۷۔ ٹوٹا ہوا کھلونا ۸۔ دو آنے ۹۔ نیلی فراک

۱۰۔ کس کا منہ دیکھا تھا ۱۱۔ کیا دستور دنیا یہی ہے ۱۲۔ گولیاں

۱۳۔ تاروں کی چھیا میں ۱۴۔ زندگی کی پہلی بھول ۱۵۔ جب بیتے دن یاد آتے ہیں

۱۶۔ ۔۔۔ تم کو خبر ہونے تک

سحاب ایک دردمند دل کی مالک خاتون تھیں جنہوں نے اپنے افسانوں میں غریب، بے سہارااور معاشرتی و معاشی پابندیوں میں جکڑے ہوئے عوام کی ترجمانی کی ہے۔ انہوں نے افسانوں کا صرف ایک مجموعہ تخلیق کیا لیکن اس ایک مجموعے میں ان کے فکر کی پختگی اور سوچ کی بالیدگی کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ سحاب نے بہت کم عمری میں افسانے لکھے لیکن اس کے باوجود ان کا مشاہدہ بہت عمیق اور جدت افکار کا نمونہ ہے اگر اس صنف میں مزید رجحان رکھتیں تو آج مایہ ناز افسانہ نگاروں کی فہرست میں ان کا نام سر فہرست ہوتا۔ وہ سوچ کی تہوں کو پرت در پرت کھولتیں اور زندگی کے عمومی حالات و واقعات سے جزئیات نگاری اور مرقع نگاری کے نمونے تلاشتی ہیں۔ ان کے افسانوں کی عورت خاموش طبع، ملنسار، حالات کا بہادری سے مقابلہ کرتی ہوئی ہمارے ارد گرد کی چلتی پھرتی تصویر پیش کرتی ہے۔ ان کے افسانوں کی عورت سچی محبت کی متلاشی ہے۔ وہ تاثرات کے اظہار کے لیے اشاروں کنایوں کا سہارا بھی لیتی ہیں اور تشبیہ واستعارے کی مدد سے پیکر کشی بھی کرتی ہیں۔

افسانوی مجموعے کا پہلا افسانہ 'بدلیاں' یاسیت کا شکار لڑکی کی دلی کیفیت کا ترجمان ہے۔ روحی دنیا کی رعنائیوں سے نالاں، اداسی کا شکار ہو کر موت کی تمنائی ہے آزاد ہو کر بھی وہ خود کو ایک زخمی پرندے کی طرح بے بس اور مجبور تصور کرتی ہے اور زندگی کی قید سے رہائی پا کر فضاؤں میں بادلوں کی طرح خود کو اڑتا ہوا محسوس کرنا چاہتی ہے۔ روحی کی اداسی کا سبب بے ثبات زندگی اور مردوں کے فریب کے بارے تجزیہ ہے۔ وہ سوچتی ہے جب وہ اس دنیا سے چلی جائیگی تو اس کے رشتہ دار واحباب اسے نہیں دیکھ سکیں گے لیکن وہ بادلوں کی اوٹ سے انہیں دیکھ سکے گی۔ افسانے میں روحی کا کزن اس کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے لیکن روحی اسے دھوکا تصور کرتی ہے۔ بارش کے موسم میں آسمان پر چھائے گہرے بادلوں نے اس پر اداسی کی کیفیت طاری کر دی۔ اس کی شخصیت پر چھائی اداسی خواہشات کی عدم تکمیل کا احساس دلاتی ہے۔

افسانہ 'آہوں کے بادل' میں معاشرتی رویے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ افسانہ باپ بیٹی کی والہانہ محبت کا عکاس ہے والد کی وفات کے بعد بطور سرپرست بھائی کا تحکمانہ رویہ اور معمولی غلطی کی پاداش میں جسمانی اذیت پہنچانا ہمارے ارد گرد بکھرے کرداروں کا احاطہ کرتا ہے۔ راموکے رویے سے دلبرداشتہ ہو کر رجنی باپ اور بھائی کے رویے کا موازنہ کرتی ہے۔ پتا کے کردار میں رجنی کے لیے شفقت اور محبت کا احساس ہے جبکہ راموا س کا سگا بھائی عمر میں ایک سال بڑا ہونے کے باوجود مرد کے حاکمانہ اور جابرانہ انداز کا مظہر ہے۔ افسانے میں عورت کے ساتھ روا رکھے گئے سماجی جبر کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس حوالے سے سوچتی ہے۔

''جب پتا زندہ تھے تو۔۔ کوئی مجھے ہاتھ تک نہ لگاتا تھا۔۔ چاہے کتنی بڑی سے بڑی شرارت کرتی۔ کتنا ہی نقصان ہو جاتا مگر کسی کی مجال تھی کہ کوئی ٹیڑھی نگاہ سے بھی دیکھے۔ یہ نوبت کبھی بھی نہ آتی تھی کہ اتنی بھاری بھر کم لات۔۔ قصور صرف یہ تھا کہ پتا جی کی تصویر کا شیشہ ٹوٹ گیا۔''[۲]

افسانہ مرد معاشرے میں عورت کے استحصال کا عکاس ہے۔ عورت کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں۔ ذرا سی غلطی کی پاداش میں مار کھانا اور کوسنے سننا اس کا مقدر ہے۔ رامو کے رویے سے رجنی کے دل میں مرد سے نفرت کا جذبہ ابھرتا ہے اور وہ سوچتی ہے کہ :

''بے وقوف، سنگدل، کتنی نادان ہیں وہ عورتیں جو پتھروں کی دیکھ بھال میں اپنے ہیرے کی چمک کھو دیتی ہیں۔''[۳]

افسانہ 'دھواں' ایک یتیم اور غریب لڑکی لوئس کی کہانی ہے۔ والدین کی وفات کے بعد گرینی کی زیر کفالت تعلیم و تربیت حاصل کر کے فلاسفی کی لیکچرار کے عہدے پر فائز ہوتی ہے۔ لوئس معمولی شکل و صورت اور سانولی رنگت کی مالک لڑکی ہے جبکہ اس کے مقابلے میں اس کا دوست جوزف کھلنڈرا مزاج اور اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ لوئس جوزف کے لیے لطیف جذبات رکھتی ہے اور جوزف کی طرف سے بھی یہی گمان رکھتی ہے لیکن طبقاتی فرق اور اس کے گھر کی آرائش اور رکھ رکھاؤ اسے احساس کمتری میں مبتلا کرتے ہیں۔

افسانے کی مرکزی کردار لوئس کالج سے واپسی پر جوزف کی گاڑی سے ٹکرا کر جان لیوا حادثے کا شکار ہوتی ہے۔ انہی لمحات میں جوزف کے ساتھ ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر ذہنی صدمے سے دوچار ہوتی ہے اور اس کی روح پرواز کر جاتی ہے۔

افسانہ 'آگ جل رہی ہے' محبت اور رقابت کے جذبہ سے مزین ہے محبت اور رقابت کا جذبہ ازل سے ہی پروان چڑھ رہا ہے۔ اسی جذبے کے تحت رخسانہ اپنی بڑی بہن سے متنفر ہوتی ہے۔ مذکورہ افسانے میں مرد کی دوغلی فطرت کی عکاسی کی گئی ہے۔ مرد خود کو پارسا اور نیک ظاہر کرنے کے باوجود اپنے ظاہر و باطن میں تضاد رکھتا ہے۔ افسانے کی کردار آپا کا منگیتر پرویز بظاہر سب کے سامنے اپنی نگاہیں جھکائے مؤدب اور شرافت کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتا ہے لیکن بڑی آپا کی غیر موجودگی میں رخسانہ کے ساتھ التفات برتتا ہے۔ رخسانہ پرویز کے رویے کی بنا پر اپنی بڑی بہن سے نفرت کرنے لگتی ہے اور یوں مرد کا پر فریب رویہ خونی رشتوں میں دراڑ پیدا کر دیتا ہے۔

سحاب افسانے میں عورت کی خوش فہم سوچ کی جھلک دکھاتی ہیں۔اسی خوش فہمی کی بناپر عورت بڑے بڑے دھوکے کھاتی ہے اور سنبھلنے تک اپنی زندگی کے بہت بڑے اور تلخ تجربے سے دوچار ہو جاتی ہے۔ عورت زندگی میں ایک بار محبت کرتی ہے اور جسے اپنا سمجھ لے اس کے ساتھ پوری زندگی گزارنے کا عہد کر لیتی ہے جبکہ اس کے برعکس مرد محبت کا فریب دے کر اپنی ترجیحات بدلتا اور بہتر سے بہتر کی تلاش کا خواہاں رہتا ہے۔

افسانہ 'کس قدر رنگین ہے راہ محبت کا فریب' بھی کچھ ایسے ہی جذبات واحساسات کی عکاسی کرتا ہے۔افسانہ سادہ اور بیانیہ انداز میں ہے۔افسانے کی کردار صبیحی اپنے خالہ زاد راحیل کی پر فریب باتوں میں آکر اس کے لیے لطیف احساسات کو دل میں جگہ دے بیٹھتی ہے۔اس سے ملنے اور چھٹیاں گزارنے خالہ کے گھر رہنے چلی جاتی ہے لیکن راحیل کے بدلے ہوئے رویے سے اچنبھے کا شکار ہوتی ہے۔ راحیل کے لیے اب گھر کے کام والی معمولی شکل وصورت اور سانوی رنگت کی مالک لڑکی صدی ترجیح بن چکی ہے۔اس حقیقت کا انکشاف اسے تب ہوتا ہے جب سوئیٹر کا تحفہ دینے راحیل کے کمرے میں جاتی ہے تو راحیل اور صدی کا التفات دیکھ کر سوئٹر اس کے ہاتھوں سے گر جاتا ہے۔

اسی طرح افسانہ 'نین ہین کو راہ دکھاؤ' بھی محبت میں ناکامی کی داستان لیے ہے۔افسانہ 'نین ہین کو راہ دکھاؤ' کی مرکزی کردار شفق محبت میں ناکامی کے بعد بستر مرگ پر پہنچ جاتی ہے اور ٹی بی جیسے موذی مرض کا شکار ہو جاتی ہے۔ ککی سے ملاقات اور پھر منگنی ہونے پر ہر لڑکی کی طرح اس کی سوچ کا محور صرف ککی اور اس کی باتیں تھیں لیکن تین سال بعد ککی اسے بھول جانے کا کہتا ہے۔اس کے الفاظ شفق کے دل میں کانٹوں کی طرح چبھتے ہیں۔ بے یقینی کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

> ''ہاں اس نے یہ بھی کہا تھا، پاک محبت شادی کے بعد نہیں رہتی۔یہ میرا ذاتی تجربہ ہے اور میں کانپ گئی تھی۔کیا کہا آپ کا ذاتی تجربہ_ میں سرد سی پڑ گئی تھی۔''[۴]

افسانہ 'ٹوٹا ہوا کھلونا' عدم اعتمادی کا شکار لڑکی ساحرہ کی داستان ہے جو مرد کو ایک ٹوٹے ہوئے کھلونے سے تشبیہ دیتی ہے۔ ساحرہ اپنے منگیتر اور کزن نجمی کو روشنی کے افکار کی روشنی میں تجزیہ کر کے دل میں بدگمانی پیدا کر لیتی ہے۔ جب نجمی اور روحی ساتھ ملکر پارٹی میں لے جانے کے لیے آتے ہیں۔روحی نجمی کے دیے گئے تحفے کے بارے میں بتاتی ہے تو بدگمانی کے زیر اثر ساحرہ اپنی منگنی کی انگوٹھی اتار کر روحی کو پہنا دیتی ہے اور شدید صدمے سے دوچار ہو کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔

افسانہ 'دو آنے' غریب اور معصوم رامو کی لمحاتی خوشی کا عکاس ہے۔ پیسہ انسان کی بنیادی ضرورت ہے یہی طبقاتی تقسیم کا ذریعہ بھی ہے۔ ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے بسااوقات انسان حقیر شعبے کو بھی اپناتے ہوئے عار محسوس نہیں کرتا تاکہ کسی دوسرے کے آگے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہ آنے اور چند پیسے کما کر ضروریات زندگی کو پورا کیا جاسکے۔

افسانہ 'دو آنے' کا کمل، سریش کی ماں کا بلغم شیشی میں ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا ہے جس کے بدلے میں سریش کی ماں اسے دو آنے اجرت کے طور پر دیتی ہے۔ کمل وہ پیسے اپنے بیٹے رامو کے ہاتھ میں آکر تھماتا ہے تو رامو کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ وہ دو آنے پاتے ہی خود کو زمیندار کے بیٹے راجو کے مقابل محسوس کرنے لگتا ہے۔ اسی اثنا میں رامو کی ماں رامو کو کنویں سے پانی بھرنے کے لیے بھیجتی ہے۔ پانی کی بالٹی کھینچتے ہوئے جیسے ہی رامو جھکتا ہے دو آنے کنویں میں جا گرتے ہیں۔

افسانے میں بتایا گیا ہے کہ طبقاتی تقسیم کی دیوار عمر کے خاص حصے میں حائل نہیں ہوتی بلکہ معصوم ذہنوں کو نسل در نسل اسی پس ماندگی کی بھینٹ چڑھنا پڑتی ہے۔ راجو اور رامو کمسن ہونے کے باوجود طبقاتی تقسیم کی بنا پر ایک دوسرے کے رقیب نظر آتے ہیں۔

افسانہ 'نیلی فراک' غربت و افلاس اور یتیمی و محرومی کی تصویر لیے زندگی کی حقیقتوں سے روشناس کراتا ہے۔ افسانے کی مرکزی کردار عذرا والدین کی وفات کے بعد دادی کے ساتھ کوٹھڑی میں رہنے اور دوسرے کے گھروں سے خیرات لے کر کھانے پر مجبور ہے۔ ایسی زندگی کی بجائے وہ محنت کرنے کو ترجیح دیتی ہے اور ایک سیٹھ صاحب جن کی شرافت کا تذکرہ عام سن کر ان کے گھر جاتی ہے۔ وہاں چھوٹی بچی پروین بی بی کی دیکھ بھال کے فرائض سرانجام دیتی ہے۔ پروین بی بی کی نیلی فراک دیکھ کر اس کے دل میں اس طرح کا لباس خریدنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ لیکن برابری کے خوف سے ہمت نہیں کر پاتی۔

افسانہ 'کس کا منہ دیکھا تھا' نام کی مناسبت سے کام کی عدم تکمیل سے مشروط ہے۔ افسانے کا بنیادی موضوع برصغیر پر برطانوی تسلط اور اجارہ داری کی طرف توجہ مبذول کروانا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برطانوی حکومت نے تمام شعبہ ہائے زندگی پر اپنا تسلط قائم کیا اور مسلمانوں کو ایک محکوم قوم کے طور پر اسلامی علوم سے دور رکھ کر عیسائیت کا پرچار کیا۔ عیسائیت کی ترویج کے لیے اداروں کے انتظامی امور انگریزوں نے اپنے ہاتھ میں لے کر سکولوں میں عیسائی تعلیم عام کی جن کا مقصد برطانوی راج مضبوط کرنا تھا۔

افسانہ 'کس کا منہ دیکھا تھا' میں عربک سکول میں برطانوی تسلط کے پڑنے والے اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کہانی روحی کے گرد گھومتی ہے جو عربک سکول میں فرح کے داخلے کی غرض سے جاتی ہے۔ روحی خود بھی اسی ادارے سے فارغ التحصیل ہو چکی تھی لیکن نئی پرنسپل کے آنے سے جہاں قوانین و ضوابط میں تبدیلی نظر آئی ساتھ ہی عیسائیت کے پرچار کی عکاسی بھی اسمبلی کے طریقہ کار سے ملتی ہے۔ داخلے کی غرض سے جانے پر صبح سے دوپہر تک پرنسپل کی قیام گاہ کے باہر انتظار اور اس پر پرنسپل کا تحکمانہ رویہ روحی کو رلانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ مجبوراً بغیر داخلہ کروائے دونوں واپس گھر کو لوٹ جاتی ہیں۔

افسانہ 'گولیاں' پاگل لڑکی کی کہانی ہے جو اپنی زندگی کی خوشیوں سے محروم ہو کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ پاگل لڑکی ہاتھوں میں مٹی کی گولیاں بنا کر اپنے باپ کو دکھاتی ہے تو باپ کو اپنی لخت جگر کی حالت دیکھ کر اس کی پرورش کا واقعہ یاد آجاتا ہے۔ کتنے ناز و نعم سے پالنے کے باوجود تقدیر کے لکھے کو نہیں مٹا سکا۔ بیٹی کی شادی کے تین ماہ بعد ہی اس کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے اور بیٹا پیدا ہوا تو وہ بھی کم عمری میں وفات پا گیا۔ بیٹے سلیم کی وفات کے صدمے نے اس کے حواس معطل کر دیے۔ اب مٹی کی گولیاں اس کی خوشی اور مسرت کا ساماں ہیں۔ وہ انہیں اپنے بیٹے سلیم کا کھلونا سمجھ کر خوش ہوتی ہے۔ اس کا کل وقتی مصرف سلیم کی یاد کے سہارے جینا ہے۔

افسانہ 'تاروں کی چھیا میں' رومانیت پر مبنی افسانہ ہے۔ افسانہ میں بتایا گیا ہے کہ جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کے مالک انسان میں بھی گوشت پوست کا دل موجود ہوتا ہے اور ایک عام انسان کی طرح جذبات و احساسات رکھتا ہے۔ افسانہ رومانیت پر مبنی رضیہ اور راحیل کی خاموش محبت کا عکاس ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لطیف جذبات رکھتے ہیں لیکن اظہار نہیں کر پاتے۔ رضیہ اپنی دلی کیفیت کا اظہار اپنی دوست اور راحیل کی بہن رخشی سے کرتی ہے۔ رخشی اپنے بھائی کے اڑیل مزاج اور غرور کی وجہ سے اسے بھول جانے کا مشورہ دیتی ہے۔ راحیل ان دونوں کی باتیں چھپ کر سن لیتا ہے۔ عین اسی لمحے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے اچانک ایک مادہ سانپ رضیہ کے کھلے بالوں سے لپٹ کر گردن کے گرد ہالہ بنا لیتی ہے۔ تب راحیل فوراً ملازم کی مدد سے سانپ کے حصار سے اسے نجات دلاتا ہے۔ رضیہ خوف کے مارے بے ہوش ہوتی ہے جسے ہوش میں لانے کے لیے راحیل کی فکر مندی رضیہ کے شبہات ختم کر دیتی ہے۔

جاگیر دارانہ نظام نے انسان کی سوچ اور طرز تخاطب کو بھی تبدیل کیا۔ رعونت اور دبدبہ شخصیت کا خاصا قرار پایا۔ تعلیم و تہذیب جاگیر دارانہ سوچ کے آگے ہیچ رہی ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود سوچ تبدیل نہ ہونے پر طنز اور تاسف کا یوں اظہار کیا ہے۔

''ایم اے کرنے پر بھی وہی ایک زمینداروں جیسے دماغ کا مالک پرانی لکیر کا فقیر_____ کتنا مغرور قسم کا انسان۔''[۵]

افسانہ 'زندگی کی پہلی بھول' بے ثبات دنیا کے نظام اور انسانی فطرت کی طرف اشارہ ہے۔ دنیاوی رشتوں کو نبھاتے نبھاتے انسان حقوق اللہ سے غافل ہو جاتا ہے جو اس کی بخشش اور آخرت کا وسیلہ بنتے ہیں۔ افسانے میں بتایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی روح اپنے گھر اپنے پیاروں کو دیکھنے جمعرات کے روز جاتی ہے۔ وہی دیکھتا ہے کہ اس کا بیٹا تکلیف میں مبتلا ہو کر والد کو یاد کرتا ہے۔ بیٹے کی حالت دیکھ کر باپ بے چین ہوتا ہے لیکن اپنی بیٹی اور بیوی کو دنیا میں گم دیکھ کر اس کے کرب میں اضافہ ہوتا ہے۔ تب اسے احساس ہوتا ہے کہ شاید یہی دنیا کا دستور ہے کہ انسان غافل ہو کر اپنی آخرت کی بجائے دنیاوی رشتوں کو کل کائنات تصور کرتا ہے۔ اور زندگی کا سامان تیار کرنے سے غافل ہو جاتا ہے۔

افسانہ 'جب بیتے دن یاد آتے ہیں' بے فکری اور لاابالی زندگی کی ترجمانی ہے۔ افسانے کی مرکزی کردار روحہ سکول کے گزرے ہوئے خوشگوار لمحات کو یاد کرتی ہے۔ سکول چھوٹ جانے کے بعد گھر کے لگے بندھے اوقات کار اور دوستوں سے دوری طبیعت میں بیزاری پیدا کر دیتے ہیں۔

اس مجموعے کا آخری افسانہ '۔۔ تم کو خبر ہونے تک' محبت کی ایک مثلث ہے۔ جہانوں اور صہیب ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار تھے لیکن جہانوں کے والدین اس کی شادی سلمان سے کر دیتے ہیں۔ جہانوں اپنی پہلی محبت کو نہیں بھلا پاتی اور دونوں زندگیوں کو خراب کرنے کی خود کو ذمہ دار قرار کر دیتی ہے۔ یہی افسوس اسے زندگی کی آخری سٹیج پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اپنی غلطی سدھارنے کے لیے اپنی بہن ثروت سے اس کی محبت کی قربانی مانگتی ہے اور اسے سلمان سے شادی کرنے کی درخواست کرتی ہے۔ جہانوں صہیب کے لیے اپنے ہاتھ سے بنی ایک تصویر کا تحفہ آخری نشانی کے طور پر دیتی ہے ثروت اتنے بڑے فیصلے کے لیے خود کو تیار نہیں کر پاتی۔ اسی کشمکش میں ثروت کے ہاتھوں سے گر کر تصویر کا شیشہ ٹوٹ جاتا ہے۔ تب اچانک اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جہانوں باجی تصویر کو اٹھائے حیران و پریشان اسے دیکھ رہی ہوں۔

افسانہ 'کیا دستور دنیا یہی ہے' غربت و افلاس اور معاشرتی رویوں کی تصویر لیے ادنی طبقے کے استحصال کے روایتی موضوع پر ہے۔ شمیم اور اس کا چھوٹا بھائی ناصر یتیمی اور غربت کی تصویر لیے دوسروں کے گھر کام کرنے پر مجبور ہیں۔ شمیم رات گئے تک گھر کے سارے کام کرتی اور اس کا بھائی ناصر مالکن کے بیٹے کے لیے کھلونے کی مانند ہے۔ وہ اس کی ماریں سہتا اور کھیل کے دوران مار کھا کر بھی حرف شکایت زبان تک لانے کی مجال نہیں رکھتا۔ شمیم اپنے بھائی کی حالت دیکھ کر التجا کرتی ہے تو اسلم اسے کھیل کا کہہ کر چپ کروا دیتا ہے۔ معصوم ناصر کی کیفیت کی عکاسی یوں کی گئی ہے۔

"اسلم بھیا کیوں مارتے ہو.....چپ رہو جی ہم گھوڑا گھوڑا کھیل رہے ہیں..... چل ناصر...ناصر لکڑی کے پڑتے ہی بھاگنا چاہتا تھا۔ مگر قدم زمین پر تھے ..... اور التجا بھری نگاہیں شمیم پر ..... غریب بہن کیا کر سکتی تھی۔ اس کا یتیم معصوم بھائی اس کے جگر کا ٹکڑا تھا ..... مگر آہ وہ نوکر تھا۔۔۔اور وہ آقا..... ایک، دو، تین تیسری لکڑی پر ناصر بے تحاشہ بھاگتا ہوا نظروں سے غائب تھا۔"[۶]

حصہ دوم

سحاب کی خاکہ نگاری کے دو مجموعے منظر عام پر آئے۔ان کا پہلا مجموعہ 'میرا کوئی ماضی نہیں' ۱۹۹۵ء میں اور دوسرا مجموعہ 'روشن چہرے' ۲۰۰۲ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔ دونوں مجموعوں میں علمی، ادبی، اور سیاسی شخصیات کی زندگی کے منفرد پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ خاکوں کی پہلی کتاب 'میرا کوئی ماضی نہیں' میں بارہ خاکے ہیں جن میں بیشتر شخصیات کا تعلق آل انڈیا ریڈیو سروس سے رہا ہے۔ سحاب نے خود بھی آل انڈیا ریڈیو سے کام کا آغاز کیا۔ اس لحاظ سے انہوں نے حلقہ احباب میں شامل ان اشخاص کو اپنا موضوع بنایا جنہوں نے ان کے ذہن پر انمٹ نقش چھوڑے اور ادبی لحاظ سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان میں سب سے پہلا خاکہ 'جوش ملیح آبادی' کا ہے۔ جوش آغا شاعر قزلباش کے رفیق خاص تھے۔ اسی مناسبت سے اس خاکے کا عنوان بھی 'جوش چا' کے نام سے ہے۔ خاکوں کے عنوان یہ ہیں۔

۱۔ جوش چا	۲۔ میرا جی
۳۔ ن۔م۔راشد	۴۔ فیض صاحب
۵۔ کلرڈ پیشنٹ انشاء	۶۔ تراشیدم پرستم شکستم (بخاری صاحب)
۷۔ محمود نظامی	۸۔ میری عصمت آپا
۹۔ خدیجہ مستور	۱۰۔ جمیلہ ہاشمی
۱۱۔ نخشب جارچوی	۱۲۔ کتاب والا

سحاب کے خاکوں کی خاص بات یہ ہے کہ شخصیت کے حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے اہم واقعات بھی بیان کر دیئے ہیں۔ کس شخصیت سے کس طرح ملاقات ہوئی اور ان سے قربت کی کیا نوعیت تھی سحاب کی تصانیف کے مطالعے سے ان کی زندگی کے مختلف گوشوں سے واقفیت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر دوستوں کے اسماء، لڑکپن کے مشاغل، ملازمت، ریڈیو سے وابستگی، تحریک پاکستان کی فعال رکن، ہجرت کے واقعات، قیام پاکستان سے قبل کی

خواتین رہنماؤں کی زندگی اور ان کی جدوجہد آزادی کے واضح ثبوت اپنی تحریروں میں رقم کر دیے ہیں اور دور حاضر کے لوگوں کی بے حسی اور نمود و نمائش پر تاسف کا اظہار بھی ان کی تحریروں میں جھلکتا ہے۔

سحاب نے ان شخصی خاکوں میں ادب، سیاست، ریڈیو اور شوبز سے وابستہ شخصیات کو پیش کیا ہے۔ جو اپنے اپنے شعبوں میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ان کی ادبی حیثیت، سیرت، انداز فکر اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو وضاحت سے بیان کیا ہے جس سے شخصیت کی نجی زندگی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ وہ شخصیات کی خوبیوں کا برملا اظہار کر دیتی ہیں۔ ان کی شخصیات خوبیوں کا مرقع نہیں بلکہ انسانی زندگی کے فعال کردار ہیں جن میں ایثار، محبت، بے تکلفی اور اپنائیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ سحاب نے زندگی کا بیشتر حصہ گزارنے کے بعد اپنے ہم عصر شخصیات کو موضوع بنایا۔

مشفق خواجہ نے سحاب کی کتاب 'میرا کوئی ماضی نہیں' کو خود نوشت قرار دیا ہے کیونکہ اس میں موجود شخصیات کے احوال کے ساتھ ان کی ذاتی زندگی سے روشناس ہونے کا بھی موقع میسر آتا ہے اور یوں خود نوشت کی کمی بھی پوری ہو جاتی ہے۔ اس حوالے سے اپنے کالم 'ادبی خانہ خرابیاں' میں لکھتے ہیں:

> ''میرا کوئی ماضی نہیں، بظاہر شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے۔۔۔۔ لیکن در حقیقت یہ کتاب مصنفہ کی آپ بیتی ہے اور بقول شخصے اس میں انہوں نے اپنی زندگی کے وہی لمحے مقید کیے ہیں جو انہیں شخصیات کے جھروکوں میں سے نظر آئے ہیں۔''[۷]

مشتاق احمد یوسفی نے خلوص، سچائی اور سادہ کاری سے متصف اس کتاب کو سحاب کے حال اور مستقبل سے تعبیر کیا ہے کیونکہ اس میں موجود احباب سے ان کی دیرینہ شناسائی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں۔

> ''سحاب قزلباش نے ان شخصیتوں کو بہت قریب سے، اور تادیر دیکھا ہے۔ اور جو جھلکیاں ہمیں دکھائی ہیں وہ نہ صرف دل کو لبھاتی ہیں بلکہ ہماری معلومات میں بھی اضافہ کرتی ہیں۔''[۸]

سحاب نے کتاب کے دیباچے میں خود اعتراف کیا ہے کہ وہ بڑھاپے میں بھی دل کا کہا مانتی ہیں اور ان کے دل نے سالوں کی مسافت طے نہیں کی بلکہ وہ خوبصورت یادوں سے معمور لمحات میں جی رہی ہیں۔ ڈاکٹر پرویز پروازی کے مطابق اس بات کا ببانگ دہل اعلان ہے کہ مستقبل میں بھی یہی ماضی ان کے ساتھ رہے گا۔[۹] سحاب کی یادوں نے عمر کی بیڑیاں نہیں ڈالیں اور نہ حسین یادوں نے اداسی اور ویرانی کی چادر اوڑھی ہے۔ اسی حوالے سے مشفق خواجہ لکھتے ہیں۔

> ''ماضی تو اس کا ہوتا ہے جو گزرے لمحوں سے بہت فاصلے پر ہو۔ سحاب تو گزرے ہوئے لمحوں ہی کے درمیان سانس لیتی ہیں۔ اس لیے ان کی یہ بات واقعی درست ہے کہ ان کا کوئی ماضی نہیں ہے۔''[۱۰]

'میرا کوئی ماضی نہیں' میں شامل پہلا خاکہ اردو ادب کے قادر الکلام شاعر اور نثر نگار جوش ملیح آبادی پر لکھا گیا ہے۔ جوش ملیح آبادی کا شمار آغا شاعر قزلباش کے دیرینہ دوستوں میں ہوتا ہے۔ جوش پر لکھا گیا خاکہ ان کی وفات پر افسوس اور اہل قلم افراد کی بے حسی اور خود نمائی پر تاسف لیے ہے۔ ادیب اور شعرا جنہیں جوش سے ملنے اور ان کی عیادت کرنے کا وقت میسر نہیں آتا تھا۔ آج ان میں محبت اور عقیدت کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے اور وہ ان کی وفات پر اظہار افسوس کر رہے ہیں۔ سحاب طنزیہ اور ملامتی انداز میں اہل قلم کانفرنس میں شریک ادیبوں کو نامور شاعر کی علالت کا احساس نہ ہونے پر سرزنش کرتی ہیں۔

جوش نے زندگی میں بے شمار مصائب کا سامنا کیا۔ قیام پاکستان کے بعد جب آپ ہجرت کر کے پاکستان آئے تو آپ کو مالی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا اور بعد ازاں حکومت کی مخالفتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن پھر بھی آپ نے وضعداری سے کام لے کر خاموشی اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ ان کی ادبی کاوشوں کو بھی پذیرائی حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ اس حوالے سے سحاب تاسف کرتی ہیں کہ آپ کے کلام کو میڈیا پر متعارف نہیں کرایا گیا بلکہ اس پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ جوش صاحب لوگوں کی لایعنی باتوں کا جواب نہیں دیتے تھے بلکہ خاموشی اختیار کر لیتے۔ جوش کی وفات اور نماز جنازہ کو بھی انہوں نے موضوع بنا کر اپنی تلخی کا اظہار کیا ہے جس میں مسلم عقیدے کی پیروی کرتے ہوئے اسلامی اصولوں کے مطابق ان کی آخری رسومات ادا کر کے ان کے ایصال ثواب کے لیے دعاؤں اور آنسوؤں سے ان سے محبت کا اظہار کیا گیا ہے۔ سحاب مرنے والوں سے بھی اس طرح مخاطب ہوتی ہیں جیسے وہ پاس موجود ان واقعات کو دیکھ رہے ہوں جوش سے بھی کہتی ہیں کہ اب آپ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد آپ کی شان میں سب رطب اللسان ہوں گے اور ادبی کاوشوں پر خراج تحسین پیش کیا جائیگا۔

جوش نے اپنی آخری ملاقات میں آفتاب قزلباش کو بلوایا لیکن آفتاب اقبال کا مخدوش مالی حالات کے باعث ان سے ملاقات نہ کرنے کا سبب بھی سحاب نے واضح کر دیا۔ سحاب کی تحریر کی نمایاں خصوصیات میں حقائق کی پردہ پوشی سے گریز ہے۔ سحاب جہاں دوسروں کی مجبوریوں اور ناآسودگیوں کو بیان کر دیتی ہیں وہیں اپنے حالات بھی نہیں چھپاتیں ان کی تحریر میں نمائش کا شائبہ تک نہیں بلکہ زندگی کے نشیب و فراز کی پوری داستان رقم ہے۔

'میرا کوئی ماضی نہیں' میں دوسرا خاکہ 'میرا جی' کی شخصیت پر لکھا گیا ہے۔ میرا جی اردو ادب کے عظیم المرتبت شاعر، نثر نگار اور نقاد ہیں۔ انہوں نے نثر کو شاعری کے مبہم خیالات سے یکسر مختلف، واضح اور شفاف الفاظ میں لکھا۔ ان

کے بیشتر مضامین 'ادبی دنیا' میں شائع ہوئے۔ان کے قلم نے عالمی ادب کے معروف اور غیر معروف شہ پاروں کو تراجم کے ذریعے اردو ادب کا حصہ بنایا۔[11]

میراجی کی شاعری اور شخصیت پر اہل قلم افراد نے بہت لکھا جس میں ان کی زندگی کے نمایاں پہلوؤں، عادات و اطوار، مزاج، سراپا، کردار، غرض ہر لحاظ سے اہل ادب کے لیے توجہ کا محور رہے۔ سحاب کی میراجی سے شناسائی آل انڈیا ریڈیو کی بدولت ہوئی جہاں سحاب پروگرام اناونسر کے طور پر کام کرتی تھیں اور میراجی مسودہ نگار تھے۔ مشفق خواجہ 'میراجی' کے خاکہ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''میراجی کے اس خاکے کو اس کتاب کا گل سبد کہنا چاہیے۔''[12]

میراجی کا خاکہ اپنی معنویت کے اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ کیونکہ اس خاکہ میں سحاب نے میراجی کی شخصیت کی مکمل طور پر عکاسی کی ہے اور ان کی زندگی کے نمایاں پہلوؤں کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ جس میں میراجی کی زندگی کے خوشگوار اور ناخوشگوار دونوں پہلوؤں سے مکمل روشناس ہونے کا موقع میسر آتا ہے۔

سحاب خاکے کے آغاز میں میراجی کو واضح الفاظ میں باور کراتی ہیں کہ اگر تم زندہ ہوتے تو تم پر خاکہ نہ لکھتی۔ سحاب تصویروں سے بھی اس طرح بات کرتی ہیں۔ جیسے پاس بیٹھے دوست سے بے تکلفی سے سب راز افشا کر دے جاتے ہیں اور کہیں بھی اجنبیت اور غیر موجودگی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ تحریر سے سحاب کے الفاظ اور میراجی کے چہرے کے تاثرات دونوں کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

سحاب شاعری اور نثر کے فرق کو بیان کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک شاعری محسوسات کی رو میں بہے جانے کا نام ہے۔ خیالوں میں ہی دلفریب مناظر اور قربت کا احساس ہوتا ہے جبکہ اس کے برعکس نثر میں ہمیشہ ایک جیسی کہانیاں ہوتی ہیں۔

سحاب میراجی کی تصویر سے اگلی دنیا میں کے بارے میں سوالات کرتی ہیں ان کی مضطرب کیفیت اور میراوں کے ٹھوکروں سے جگانے کے بارے میں پوچھتی ہیں۔ میراجی کی شاعری میں ان کے نفسی میلانات اور جنسی بے راہروی کی بے شمار مثالیں نظر آتی ہیں جن کا حوالہ دے کر سحاب نے انہیں ذہنی بھوکے کا خطاب دیا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو سروس میں ملازمت کے عرصے میں ایک بار میراجی نے سحاب کی لکھی ہوئی نظم کا مذاق اڑایا تھا۔ میراجی سحاب کو نظم اور غزل کی روایتی پابندیوں سے نکال کر ردیف و قافیے کو ترک کرنے کی ترغیب دیتے میراجی خود بھی آزاد شاعری کے علمبردار تھے۔

میراجی سحاب کو چاہتے تھے اس لیے ان سے بات کرنے کا موقع تلاش کرتے اکثراوقات ان سے ان کی نئی نظموں کے بارے میں دریافت کرتے رہتے۔ سحاب کے انکار پر اپنا تازہ کلام سحاب کو دکھاتے تو وہ اتنی جلدی نظمیں لکھ لانے پر دل میں حیران ہوتیں۔ میراجی نے سحاب کا نام ان کے نام کی معنویت سے بادلی بیگم رکھا تھا۔ کیونکہ سحاب کا مطلب بادل ہوتا ہے خاتون ہونے کی بناپر انہیں بادل کی بجائے بادلی کہتے تھے۔

میراجی کی ذہنی کیفیت اور میرا سین سے شدید محبت کا اندازہ جے جے ونتی کے راگ پر میراجی کے رونے سے ہوا سحاب کے لیے میراجی کے اچانک رونے کا سبب و شوامتر کا راز عیاں کرنا تھا اور اس بات کا سوچ کر وہ سخت پریشان ہوئیں لیکن ن م راشد نے بروقت پہنچ کر جے جے ونتی کے راگ کو رونے کا سبب بتا کر ان کی ذہنی الجھن ختم کی۔

میراجی کی محبت دیوانگی کی حد کو چھونے والی تھی۔ وہ ہر چہرے میں 'میرا سین' کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے اور ریڈیو میں کام کرنے والی خواتین کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے۔ ان میں سے کچھ نظمیں 'وہ' پر لکھ لاتے۔ سحاب نے خاکے میں 'وہ' کا نام درج نہیں کیا البتہ ان کی شخصیت، کردار، زبان اور عادات واطوار کی تصویر پیش کر دی۔

اخلاق احمد دہلوی نے 'یادوں کا سفر' میں سحاب قزلباش کا نام بادلی بیگم لکھا ہے۔[13] جبکہ ڈاکٹر رشید امجد نے اپنی تصنیف 'میراجی شخصیت اور فن' میں لکھا ہے کہ میراجی سحاب کا نام بلی خانم اور صفیہ خانم کو بادلی بیگم کہتے تھے۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

> ''سحاب قزلباش کے علاہ میراجی اس زمانے میں جس دوسری خاتون میں دلچسپی لیتے وہ بدلی یا بادلی بیگم تھیں جس کا اصلی نام صفیہ معینی تھا۔''[14]

صفیہ معینی شوخ طبیعت کی خاتون تھیں اور دہلی ریڈیو اسٹیشن کی نمایاں آواز خیال کی جاتیں۔ میراجی نے ان کی محبت میں گرفتار ہو کر شادی کا پیغام بھیج دیا جس پر پہلے وہ بے یقینی کی کیفیت سے دوچار رہیں اور بعد ازاں انہوں نے میراجی کے بارے میں نازیبا الفاظ کہنے شروع کر دیئے۔ سحاب نے صفیہ معینی کے الفاظ کو انہی کی زبانی پیش کر دیا۔ میراجی ٹھکرائے جانے پر کافی دن پر ملال رہے اور ریڈیو اسٹیشن دوبارہ آمد پر ان کی قطع و برید میں مکمل تبدیلی دیکھنے میں آئی، یوں لمبے بال اور مالائیں غائب ہو گئیں البتہ 'وہ' کے چہرے کے تل پر میراجی بعد میں بھی شاعری کرتے رہے۔[15]

ن۔ م۔ راشد جدید اردو شاعری کے خالق 'ماورا'، 'لاانسان'، 'ایران میں اجنبی' اور 'گماں کا ممکن'، جیسی شاہکار تصانیف کے مصنف اور اردو شاعری کو نئی نہج سے روشناس کروانے والے عظیم المرتبت شاعر کی وفات پر سحاب قزلباش نے

خاکہ لکھا جس میں شاعر کے جلائے جانے پر گہرے تاسف کا اظہار ہے۔ن۔م۔راشد کی بیوی شیلا نے ان کی آخری خواہش کا جواز پیش کر کے ان کی لاش کو نذر آتش کرایا۔ سحاب کے لیے ن م راشد کی وفات کی طرح ان کی غیر مستند وصیت کا تسلیم کرنا بعید از قیاس ہے۔اس قبیح فعل کو روکنے کے لیے انہوں نے پاکستان ایمبسی فون کر کے شیلا کو اس طرح کرنے سے روکنے کی بھی درخواست کی لیکن چند ادیبوں اور شاعروں کی موجودگی میں شیلا کی بات کو مستند مان کر ن۔م۔راشد کو جلا دیا گیا۔

اداس نسلیں کے خالق عبد اللہ حسین نے سحاب کو فون کر کے ن م راشد کی وفات کی خبر دی اور پھر حبیب حیدر آبادی نے سحاب کو فون پر ن۔م۔راشد کی میت کو نذر آتش کرنے سے روکنے کی استدعا کی لیکن سحاب کی کوشش کے باوجود شیلا انجلینی نے راشد صاحب کی آخری وصیت کہہ کر نذر آتش کروایا۔ن۔م۔راشد کی وصیت پر عملدر آمد کے بعد سحاب نے میرا جی کو خواب میں دیکھا جو اپنے شاعر دوست کے نذر آتش کیے جانے پر لندن کے ادیبوں اور شاعروں کی بے حسی اور خاموشی پر شکوہ کناں ہوتے ہیں۔

ن۔م۔راشد کی زندگی میں ہی ان کے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ن۔م۔راشد عمر کے آخری حصے میں اداس رہنے لگے دیار غیر میں اپنے وطن اور اپنوں کی کمی بہت محسوس کرتے۔اسی بات کو محسوس کرتے ہوئے سحاب نے ن۔م۔راشد کے چوتھے مجموعے کو چھپوانے کے لیے اعجاز بٹالوی سے درخواست کی کہ وہ پاکستان میں اس کتاب کو چھپوا دیں تاکہ وہ پاکستان جا سکیں۔

مذکورہ خاکے میں سحاب نے ن۔م۔راشد کی چار نظمیں شامل کیں جن میں سے ایک نظم 'آواز' انہوں نے فوجی بھائیوں کے پروگرام کے لیے لکھی اور 'مجھے ایک نورس کلی نے یہ طعنہ دیا تھا' سحاب سے متعلق واقعے پر لکھی تھی۔

فیض احمد فیض اردو کے عظیم شاعر اور یگانہ روز شخصیت تھے انہوں نے اپنے عصر کے کرب کو اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ان کی شاعری درد محبت سے لبریز اور انقلابی شاعری ہے۔فیض احمد فیض ان چند خوش نصیب شعرا میں سے ہیں جنہیں ان کی زندگی میں ہی پذیرائی ملی اور ادب پرور شخصیات نے محبتیں نچھاور کیں۔ فیض کو سیاسی حوالوں سے بعض نامساعد حالات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو آپ کو راولپنڈی سازش کیس میں چار سال تک مختلف جیلوں میں کرب کے لمحات گزارنے پڑے۔اسیری کے دوران بھی آپ نے شاعری جاری رکھی۔زنداں نامہ میں موجود بیشتر نظمیں آپ نے اسی دور میں لکھیں۔[۱۶]

فیض احمد فیض ۱۹۵۱ء میں اس وقت کے وزیر اعظم جناب لیاقت علی خان کی حکومت کے خلاف راولپنڈی کیس میں گرفتار ہوئے اور چار سال تک سرگودھا، ساہیوال، حیدر آباد اور کراچی کی جیلوں میں نظر بند رہے۔ فیض کے اہل خانہ کے لیے یہ دور نہایت کٹھن گزرا۔ ایلس فیض نے اعلیٰ ہمتی سے کام لے کر ملازمت اختیار کی اور بچوں کی ذمہ داری بھی نہایت احسن طریقے سے نبھائی۔ فیض صاحب کے جاننے والوں نے بھی اس کڑے وقت میں ان سب سے پہلو تہی اختیار کر لی تھی۔ فیض احمد فیض نے خود ساختہ جلاوطنی کے پانچ سال بیروت میں گزارے۔ اس زمانے میں ایلس فیض ہی ان کے ساتھ رہیں۔ حکومت کی جانب سے مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور پاکستان ٹیلی ویژن کی جانب سے ان کی بیٹیوں اور دامادوں کے پروگرام نشر کرنے پر بھی پابندی عائد کر دی گئی اور فیض کو ملک کا باغی قرار دیا گیا۔[۱۷]

سحاب نے اپنے خاکے میں فیض سے متعلق تقریباً تمام واقعات کو اس خاکے کا حصہ بنایا جن میں زندگی کے سرد و گرم کا حوالہ تفصیل سے پیش کیا ہے۔ فیض علم وادب کے بہترین قدردان تھے۔ دوسرے ادیبوں کی بہترین کاوشوں کو ہمیشہ سراہتے۔ سحاب کے میرا جی پر لکھے گئے خاکے پر انہوں نے ان کے بھائی کو خط لکھ کر اس کاوش کو سراہا۔ فیض کی جاذب نظر شخصیت اور گفتار کے دھیمے پن سے لوگ ان کی شخصیت کے سحر میں جلد گرفتار ہو جاتے۔

فیض صاحب نے ہمیشہ دوستی نبھائی انہوں نے زندگی کے کٹھن مواقع پر بھی ثابت قدمی اور صبر و تحمل سے کام لیا۔ بعض سانحات نے ان کی زندگی پر دیرپا نقش مرتب کیے۔ ایسے ہی حالات کا سامنا انہیں عزیز از دوست اور ادبی مفکر، افسانہ نگار اور ترقی پسند تحریک کے بانی وروح رواں سجاد ظہیر عرف بنے میاں کی وفات کی صورت میں گہرے صدمے کی صورت میں پیش آیا۔ سجاد ظہیر اور دیگر شعرا جن میں فیض احمد فیض بھی شامل تھے، ایفرو ایشیائی مصنفین کی کانفرنس میں شرکت کے لیے الماتے (افغانستان) تشریف لے گئے جہاں سجاد ظہیر کی ناگہانی موت پر فیض احمد فیض کو لاعلم رکھا گیا اور انہیں سجاد ظہیر کی بیماری کی اطلاع دے کر افغانستان سے ہندوستان بھیج دیا گیا۔ جہاز میں فیض صاحب کو بنے میاں (سجاد ظہیر) کی وفات کا علم ہوا۔

فیض صاحب میں بدلہ لینے کی روش نہ تھی بلکہ وہ معاف کر دینے کی صفت سے معمور تھے انہوں نے بے پناہ مصائب کا سامنا کیا اور ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کی تنقید کا نشانہ بھی بنے۔ لیکن ان کے خلاف زبان یا قلم سے جہاد کی روش نہیں اپنائی بلکہ خاموشی اختیار کر لی اور وقت کو بہترین محتسب پایا۔ اس زمانے میں سحاب نے فیض کو ان کے ناقدین کی آراء سے آگاہ کیا کہ وہ آپ کو بڑا شاعر تسلیم نہیں کرتے آپ ان کی باتوں کا جواب دیں تو فیض صاحب نے ہنس کر بات ٹال دی۔

انشاءاردو ادب کے شاعر، مزاح نگار اور کالم نگار تھے جنہوں نے اپنے مزاح سے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائی، ان کا شمار اردو کے بہترین مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ خاکہ 'کلرڈ پیشنٹ انشاء' میں انشاء کی بیماری کے ایام میں لندن میں علاج کی غرض سے قیام کے عرصے میں سحاب سے ہونے والی ملاقاتوں کا تذکرہ بیان کیا گیا ہے۔ کینسر جیسی جان لیوا بیماری سے لڑتے ہوئے ان کی ہمت اور خوش اسلوبی سے تمام حالات کا مقابلہ کرنے پر داد تحسین پیش کرتی ہیں۔ انشاء کو بے چینی تھی جیسے ہر کام کی جلدی ہو۔ وہ تمام امور نمٹانے کی تگ و دو میں نظر آتے، انہوں نے اپنی بیماری کے بارے میں اپنے خاندان کو بھی لاعلم رکھا اور تنہا لندن میں رہ کر آپریشن کروایا۔

ذوالفقار علی بخاری اردو ریڈیو سروس کے حوالے سے جانا پہچانا نام جنہوں نے اپنی محنت اور لگن سے آل انڈیا ریڈیو سروس میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اور بعدازاں پاکستان ریڈیو سروس میں از سر نو اردو براڈکاسٹنگ کا آغاز کیا۔ پاکستان ریڈیو سروس کے لیے جگہ کی عدم دستیابی کی بنا پر گھوڑوں کے اصطبل میں پہلا ریڈیو اسٹیشن قائم کیا گیا۔ اس ریڈیو اسٹیشن کو بام عروج تک پہنچانے میں ذوالفقار بخاری کی شبانہ روز کوششوں کا بہت عمل دخل رہا۔ ریڈیو سروس کے عملے کی تربیت کے لیے بخاری صاحب خود گھنٹوں ریاضت کرواتے تاکہ آواز کا حقیقی تاثر اجاگر ہو سکے جو سامعین کو توجہ دلانے پر مجبور کر دے۔[۱۸]

خاکے کا عنوان 'تراشیدم، پرستم، شکستم' ذوالفقار بخاری کی جوہری کی سی پرکھ، محنت اور عظمت کی نشاندہی کرتا ہے۔ سحاب نے ان کی تراشیدم کی خوبی سے بہت استفادہ حاصل کیا اور اسی علم کی معراج لیے ریڈیو سروس میں ان کا فن مزید جِلا پاتا رہا۔ ذوالفقار بخاری ایک منظم انداز زندگی گزارنے کے عادی تھے اور ریڈیو سروس میں بھی انہوں نے تمام ملازمین کو بااصول اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں سے مکمل انصاف کرنے کا خوگر بنایا۔ صفائی پسند اس حد تک تھے کہ پورا اسٹوڈیو جگمگاتا رہتا۔ ملازمین کو رات کے اوقات میں بھی صاف لباس نہ ہونے پر سرزنش کرتے۔

ذوالفقار بخاری ایک بہترین ڈائریکٹر، پروڈیوسر، ڈراما نگار اور موسیقی کے دلدادہ تھے ان کے ہاں مذہبی اختلاف سے بالاتر ہو کر ریڈیو سروس میں ہر شخص اپنے ہنر سے پہچانا جاتا اور کبھی کسی ایک کے لیے دوسرے کی تضحیک نہ کرتے۔

سحاب کا کام بچوں کے پروگرام کی نشریات پیش کرنا تھا لیکن ذوالفقار بخاری کی پرکھتی نگاہ نے سحاب سے لازوال ڈراموں میں کام کروایا۔ ان میں ڈرامہ 'انار کلی' اور 'اسپٹنک' کے کرداروں کے لیے الفاظ اور آواز کا حقیقی تاثر پیش کرنا جان جوکھوں کا کام تھا لیکن ذوالفقار علی بخاری کی ریاضت نے اس مشکل ہدف کو آسانی سے ہمکنار کرایا۔

سحاب ذوالفقار علی بخاری کا ایک انگریز آرٹسٹ ریکس ہیری سن سے تقابل کرتی ہیں ان کے خیال میں ذوالفقار علی بخاری کے الفاظ کی ادائیگی، فقرے کے آخر تک آواز کا تاثر اور ہاتھوں کا طریقہ سب ریکس ہیری سن سے مشابہت رکھتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان سے متاثر ہو کر اسی انداز میں بولتے تھے۔[19]

ریڈیو سروس سے فراغت کے بعد نئے آنے والوں نے اس درجہ تندہی اور محنت کو شعار نہ بنایا بلکہ پروگرام کی پیش کش کو جیسے تیسے پورا کر کے فرائض سے عہدہ برآ ہو جاتے اور ذوالفقار علی بخاری کی ریٹائرمنٹ کے بعد ریڈیو اسٹیشن آمد انہیں ناگوار گزرتی۔ سحاب تاسف کرتی ہیں کہ اس درجہ لاپروائی نے ریڈیو اسٹیشن کو دوبارہ اصطبل بنا دیا ہے۔

محمود نظامی ریڈیو سروس کے حوالے سے جانا پہچانا نام جنہوں نے ذوالفقار بخاری کی معیت میں آل انڈیا ریڈیو سروس اور ریڈیو پاکستان سروس میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر آزمائے۔ وہ ریڈیو سروس میں فوجی بھائیوں کے پروگرام کے انچارج کی حیثیت سے کام کر رہے تھے جب پہلی بار سحاب کا ان سے تعارف ہوا۔ اس وقت سحاب کی عمر تقریباً گیارہ برس تھی۔ اتنی چھوٹی سی بچی کو فوجی بھائیوں کے پروگرام کی نشریات کے لیے مقرر کرنے پر محمود نظامی پہلے پہل پریشان ہوئے لیکن سحاب کی آواز سن کر مطمئن ہو گئے۔

محمود نظامی شوخ مزاج اور زندہ دل شخصیت تھے جنہوں نے اپنی زندہ دلی سے ریڈیو سروس کے عملے کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ محمود نظامی کے سر کے بال اتر چکے تھے سحاب کی جب ان پر نظر پڑتی تو وہ ان کے سر کا بغور مشاہدہ کرتیں ایک دن نظامی صاحب نے ان کی اس عادت کو پکڑ میں لے کر خوب مذاق اڑایا، سحاب نے بات سنبھالنے کے لیے بہانہ کیا کہ سر کے بال نہ ہونے کی وجہ سے آپ پر موسمی اثرات کا زیادہ اثر ہوتا ہو گا۔

'میرا کوئی ماضی نہیں' میں تین خاکے اردو ادب کی نامور خواتین پر لکھے گئے ہیں پہلے خاکے میں عصمت چغتائی کی ادبی و نجی زندگی کے بارے میں تفصیلی بیان کیا ہے۔ عصمت چغتائی اردو ادب کی نامور نثر نگار جنہوں نے افسانہ، ناول، خاکہ نگاری، رپورتاژ اور سوانح نگاری جیسے متنوع موضوعات کے ذریعے اردو ادب کو بیش قیمت ادبی خزینے سے سرفراز کیا۔ عصمت چغتائی نے عورتوں کے نفسیاتی اور معاشرتی مسائل کو بے باکی سے افسانوں میں بیان کیا ہے۔ اس خاکے کے عنوان 'میری عصمت آپا' سے ہی بے تکلفی اور انسیت کا تاثر ملتا ہے۔

عصمت چغتائی کے مضبوط وجود کے اندر ایک معصوم سہمی ہوئی بچی کا دل تھا جو عورت کی تذلیل کو برداشت نہیں کر پاتا وہ عورت کی مظلومیت اور کم ہمتی پر کڑھتیں اور مرد کے حاکم و جابر انداز کو ملامت کرتیں۔ سحاب نے عصمت چغتائی

کی شخصیت کو پرت در پرت کھولا اور ان کے مزاج، عادات، طرز تکلم، سوچ، احساسات، دردمندی اور خردمندی کی روشن مثالیں پیش کی ہیں۔ بظاہر یہ خاکہ چند ہفتوں کی ملاقات کا احوال ہے۔ لیکن اس مختصر سے عرصے میں شخصیت کی اس طور سے پہچان ایک کامیاب خاکہ نگار ہی انجام دے سکتی ہیں۔ وہ ایک خوددار عورت، بہترین دوست اور غمگسار تھیں۔ سحاب نے ان کی ذاتی زندگی کے واقعات کو بھی رقم کیا ہے۔ عصمت ایک مضبوط عورت اور ایک شفیق ماں بھی تھیں جس نے اپنی اولاد کی خوشیوں کو مقدم جانا۔

عصمت چغتائی مسلم مذہب سے تعلق رکھنے کے باوجود بھی ہندو مذہب کی طرف ذہنی میلان رکھتی تھیں۔ اس بنا پر اپنی وصیت میں مرنے کے بعد دفنا دینے کی بجائے ہندووانہ رسم کے مطابق جلانے کا کہا۔ ان کی بیٹی سیمانے نوین نامی لڑکے سے شادی کے لیے اپنا مذہب چھوڑ کر ہندو مذہب اپنا لیا تھا اور یوں باآسانی عصمت کی وصیت پر عمل کرنے میں انہیں کسی قسم کا تامل نہ ہوا۔ لیکن سحاب ان کے اس عمل پر سرزنش کرتی ہیں۔

سحاب واقعات کو اس خوبصورتی سے بیان کرتی ہیں کہ شخصیت، اطوار، مزاج، انداز و گفتار میں تندی و تیزی اور وسیع مطالعہ سے سامنے والے کو چاروں شانے چت کر دینے کی صلاحیت رکھنے والی عصمت چغتائی کی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

خدیجہ مستور کا خاکہ تعارفی حیثیت رکھتا ہے اس میں شخصیت کے ظاہر و باطن سے مکمل شناسائی نہیں ہو پاتی بلکہ ان کی وفات کے بعد ان کے ادبی کارناموں پر ایک خراج تحسین لیے ہے۔ سحاب نے اس خاکے میں اپنی پہلی ملاقات کا تذکرہ اور اس سے بیشتر خدیجہ سے ملنے کے اشتیاق کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ خدیجہ مستور کا شمار سحاب کی ہم عصر خواتین میں ہوتا ہے خدیجہ نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں ایک سمجھدار اور باشعور عورت کا تصور دیا ہے جس میں رومانویت کا عنصر بھی شامل ہے۔ خدیجہ ایک ایسے معاشرے کی تمنائی رہیں جس میں تفرقہ و فساد نہ ہو اور سب کے لیے برابر حقوق رائج ہوں۔

خدیجہ مستور کے خاوند کا تعلق صوبہ پنجاب سے تھا۔ خدیجہ کے افسانوں اور ناولوں میں مہاجرین کا درد و کرب جھلکتا ہے۔ سحاب نے خاکے میں خدیجہ مستور کے تاثرات کا سرسری تذکرہ کیا ہے اور ان کی تحریروں کے موضوعات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

جمیلہ ہاشمی کے خاکے میں ان کے نوبل انعام یافتہ ناول' چہرہ بہ چہرہ، روبرو' کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے جمیلہ ہاشمی نے قرۃ العین طاہرہ کی زندگی کو تاریخ کے جھروکوں سے پیش کیا۔ انہوں نے وسیع مطالعہ اور بطور خاص انگریز ادیبوں

کی قرۃ العین طاہرہ پر لکھی جانے والی تحریروں کا بغور مطالعہ کر کے حقائق کو جانچ پرکھ کر اس مایہ ناز تصنیف کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ سحاب نے چیدہ چیدہ واقعات کو قلمبند کر کے اس ادبی کارنامے کے محاسن اجاگر کیے ہیں۔

نخشب جارچوی کی وفات پر لکھا جانے والا خاکہ نخشب کے التفات اور دلی وابستگی کا بین کرتا ہے۔ سحاب نے تمام واقعات کو اپنے اور نخشب کے تاثرات کے ساتھ بیان کیا ہے اور اپنے کڑوے رویے پر ان سے معافی بھی مانگی ہے۔ سحاب حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے واقعات کو من و عن پیش کر دیتی ہیں چاہے اس سے ان کی اپنی شخصیت پر بھی ضرب پڑ رہی ہو۔ نخشب سے ان کو چڑ تھی اس کی وجہ نخشب کی گفتگو بھی تھی۔ اس حوالے سے انہی کے الفاظ میں لکھتی ہیں:

> ''تمھارا قصور نہیں۔ اللہ میاں نے عورتوں کا خانہ ہی ایسا کھلا چھوڑ دیا جتنی جس میں عقل ہوا تنی ہی تو بات کرے گی۔'' [۲۰]

نخشب آغا سرخوش کے قریبی دوستوں میں سے تھے اور گھر کے فرد کی حیثیت سے رہتے۔ وہ ہر ہفتے ریڈیو میں پروگرام کی غرض سے میرٹھ سے دلی آتے اور سحاب کے گھر کے مردان خانے میں قیام کرتے۔

نخشب جارچوی نے ریڈیو سروس سے آغاز لیکر فلمی دنیا تک عروج حاصل کیا اور بے پناہ شہرت و ناموری سمیٹی لیکن حقیقی زندگی میں وہ اپنی رفتار سے تھک چکا تھا۔ ان احساسات کی سحاب نے آگہی حاصل کر کے ایک کامیاب و نامور انسان کی زندگی کے پنہاں راز سے پردہ کشائی کی۔

اس کتاب کا آخری خاکہ سحاب قزلباش نے اپنے منجھلے بھائی آغا سرخوش قزلباش پر 'کتاب والا' کے نام سے رقم کیا ہے۔ دیگر خاکوں کی طرح یہ خاکہ بھی شخصیت کی وفات کے بعد ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر لکھا گیا ہے۔ آغا سرخوش کا تعلق علم وادب سے تا عمر رہا۔ کتاب ان کی بہترین رفیق رہی۔ انہوں نے ادارت کے فرائض بخوبی سرانجام دیئے۔ قیامِ پاکستان سے قبل دہلی میں 'چمنستان' رسالے کی ادارت سنبھالی اور ساتھ ہی 'نگارستان ایجنسی' میں نادر و نایاب کتب کا ذخیرہ جمع کیا لیکن قیام پاکستان کے بعد اس قیمتی اثاثے کو اونے پونے داموں بیچ کر پاکستان کے شہر کراچی میں از سرنو دوبارہ ادارت اور کتب کی خرید و فروخت کا کام شروع کیا۔ انہوں نے ' نورنگ' رسالہ نکالا، اور ساتھ ہی 'کتاب محل' کے نام سے کتب کی فراہمی کا کاروبار بھی جاری رکھا۔ آغا سرخوش قزلباش کو شاعری سے گہرا لگاؤ تھا اور خود بھی شاعر تھے ان کی شاعری اور فطرت کے حوالے سے شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں:

> ''آغا شاعر منجھلے صاحب زادے ہیں۔ شعر خوب کہتے ہیں مگر سناتے نہیں اور نمود سے گھبراتے ہیں۔'' [۲۱]

ان کے خاکوں کے دوسرے مجموعے کا نام 'روشن چہرے' ہے اس کا نام تصنیف میں شامل شخصیات کی فنی کاوشوں کا خراج عقیدت پیش کرنے کے حوالے سے تجویز کیا گیا۔ سحاب نے اس تصنیف میں علمی، ادبی، سیاسی اور شوبز کی شخصیات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس میں کل چودہ شخصیات پر خاکے تحریر کیے گئے ہیں۔ عنوانات درج ذیل ہیں۔

۱۔	بیگم شاہ نواز	۲۔	ہمارے زمانے کی بیگم لیاقت
۳۔	نشتر صاحب	۴۔	بیگم ولی خان
۵۔	ممتاز حسن صاحب	۶۔	قرۃ العین حیدر
۷۔	ساحر لدھیانوی	۸۔	رضیہ آپا
۹۔	نظر حیدر آبادی	۱۰۔	للتا احمد
۱۱۔	کامنی کوشل۔ اوما کیشپ	۱۲۔	ناہید صدیقی
۱۳۔	ریشماں	۱۴۔	اے ری میں تو در دنہ جانوں کوئی

سحاب قزلباش نے زندگی کا اہم حصہ ادب پرور اشخاص اور سیاسی، علمی و ادبی افراد کے ساتھ گزارا۔ قیام پاکستان سے قبل انہوں نے وطن عزیز کے لیے بہترین ورکر کے طور پر خدمت سرانجام دیں اور ملک کے رہنماؤں کو قریب سے دیکھنے اور معاون کی حیثیت سے کام کرنے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ انہی شخصیات کا تذکرہ انہوں نے اپنی تصنیف 'روشن چہرے' میں کیا ہے۔ روشن چہرے میں ان کی بہترین یادیں بکھری ہوئی ہیں جنہیں ایک فاصلے سے دیکھا اور ان کے سحر میں گرفتار ہوئیں اور ایسی شخصیات کا بھی ذکر ہے جو ان کے رفیقوں میں شمار ہوتی ہیں۔ اس تصنیف میں خاکوں سے قبل شخصیات کی تصویریں دی گئی ہیں۔ چودہ خاکوں میں سے گیارہ خاکوں کے ساتھ تصاویر موجود ہیں ان میں رضیہ آپا، نظر حیدر آبادی اور للتا احمد کے خاکوں کے ساتھ تصاویر نہیں دی گئیں۔ سحاب کی خاکوں کی یہ تصنیف ان کی وفات سے دو سال قبل یعنی ۲۰۰۲ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔ خاکوں کے اس دوسرے مجموعے کے حوالے سے انہوں نے چند لفظوں میں لکھا ہے:

''خاکوں کے اس دوسرے مجموعے میں، میں نے اپنی دنیا کے کچھ اور لوگوں کی یادیں سجادی ہیں۔''[۲۲]

ان تحریروں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی یہ تحریریں ان کی بھولی بسری یادیں ہیں جنہیں لکھتے ہوئے بعض اوقات وہ افسردہ ہو جاتی ہیں اور کہیں سرشاری کی کیفیت میں آجاتی ہیں۔ یہی تحریریں ان کا کل اثاثہ حیات ہیں جسے انہوں نے چیدہ چیدہ بیان کیا ہے۔

'روشن چہرے' میں سب سے پہلا خاکہ 'بیگم شاہنواز' کے نام سے ہے جس میں انہوں نے بیگم شاہنواز کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ بیگم شاہنواز کی شخصیت خواتین کے لیے رہنما کا درجہ رکھتی تھی۔ اس خاکے کے ذریعے بیگم شاہنواز کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے متفرق معلومات ملتی ہیں ساتھ ہی تحریک آزادی میں شامل نامور خواتین کا بھی ذکر کیا گیا ہے جس سے ان کی ہم عصر اور اس جدوجہد میں شمولیت اختیار کرنے والی خواتین سے روشناس ہونے کا بھی موقع ملتا ہے۔ بیگم شاہنواز کے ساتھ بیگم اکرام اللہ بھی ان جلسوں کی قیادت میں پیش پیش ہوتیں۔ سحاب نے بیگم شاہنواز کا تعارف کروانے کے ساتھ ہی ان کی سیاسی سرگرمیوں اور مختلف تنظیموں میں کلیدی عہدوں کے امور نبھانے، جلسوں میں شرکت کرنے کے ساتھ نہایت کم الفاظ میں ان کی شخصیت، لباس اور گفتار کے بارے میں معلومات پیش کیں جن سے ان کی شخصیت کی ایک عمدہ تصویر سامنے آتی ہے۔

سحاب قزلباش کی تحریریں شگفتہ اور سادہ انداز میں ہیں۔ تحریر پڑھتے ہوئے قاری خود کو اس ماحول کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے، اور جذبات واحساسات سے بھرپور تحریریں سبک رفتاری سے ایک کردار سے دوسرے کردار کو اپنے اندر ضم کرتی چلی جاتی ہیں لیکن انہیں پڑھ کر بیزاری کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ بیگم شاہنواز سے آغاز ہونے والا یہ خاکہ کلی طور پر ان کی شخصیت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس تحریک آزادی میں شامل دیگر شخصیات کے نام بھی شامل حال رہے اور قیام پاکستان کے وقت مسلمانوں نے جان و مال کے جو نذرانے پیش کیے ان کے بارے میں بتایا اور ساتھ ہی عظیم رہنمائے ملت قائد اعظم کی شخصیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ دور حاضر کی نسل کی مردہ دلی کو بھی سحاب نے بیان کیا ہے اور محب وطن پاکستانیوں کے لیے دعا کی ہے۔

بیگم شاہنواز عزم وہمت اور ولولے کا عظیم نمونہ تھیں۔ جنہوں نے جان و مال اور اولاد سے بھی بڑھ کر اس وطن عزیز کو اہمیت دی اور اس کے لیے ہمیشہ ہمت و حوصلے سے کام لیا۔ بیگم شاہنواز نے اپنی بیٹی کی حادثاتی موت پر جس درجہ صبر واستقامت سے کام لیا وہ قابل داد تھا۔ اس خاکے سے بیگم شاہنواز کی حب الوطنی زندگی کے دیگر امور پر حاوی اور مقدم نظر آتی ہے جن کا مقصد حیات مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کا حصول ہے۔

زیر نظر تصنیف میں دوسرا خاکہ بیگم لیاقت علی خان کا ہے۔ بیگم رعنا لیاقت علی پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی بیوی تھیں جنہوں نے اپنے شوہر کی طرح خود بھی تحریک آزادی کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خواتین رہنماؤں کا کام خواتین میں جدوجہد آزادی کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے اجلاسوں کے اہتمام کیے جاتے۔ جن کے انتظامی امور بیگم شاہنواز، بیگم رعنا لیاقت علی خان، بیگم اکرام اللہ اور دیگر ورکرز سنبھالتیں اور سحاب قزلباش اپنی دوستوں کے ساتھ مل کر مختلف ذمہ داریاں انجام دیتیں جن میں مسلم لیگ کے جھنڈے بیچنا، لوگوں سے ملک کے لیے چندہ وصول کرنا اور وطن کے گیت گا کر جذبہ آزادی کو پروان چڑھانا تھا۔ بیگم رعنا لیاقت علی خان کی سیاسی و سماجی کاوشیں بے مثال ہیں۔ انہوں نے اپوا برانچ، ویمنز نیشنل گارڈز اور وومینز کلب جیسی تنظیمیں تشکیل دے کر خواتین کی فلاح و بہبود اور شعور اجاگر کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کیا۔''[۲۳] سحاب نے قیام پاکستان کے دور کو نہایت قریب سے دیکھا اور خواتین رہنماؤں کے قول و فعل کو پرکھنے کا موقع بھی میسر آیا۔ ان کی زندگی میں ایسے رہنماؤں کے لیے محبت سے گندھے جذبات و احساسات ہیں جنہوں نے جو درس دوسروں کو دیا پہلے خود ان پر عمل پیرا ہوئیں۔

زیر بحث خاکے میں سحاب قزلباش نے بیگم رعنا لیاقت علی خان کی سیاسی و سماجی سرگرمیوں اور بحیثیت رہنما ان کاوشوں سے قاری کو روشناس کرایا ہے اس میں ان کی داخلی زندگی کی شبیہہ پیش نہیں کی گئی اور نہ ان کے خاندان کے بارے میں کوئی معلومات پیش کی گئی ہیں البتہ بحیثیت رہنما تحریک پاکستان انہوں نے جو فعال کردار ادا کیا اس کے بارے مکمل معلومات پیش کی گئی ہیں جس سے ان کی زندگی کے ایک خاص پہلو یعنی ایک خاتون سے بڑھ کر ایک رہنما خاتون کے حوالے سے خدمات کو سراہا گیا ہے۔

خاکوں کے دوسرے مجموعے 'روشن چہرے' میں سحاب کی تحریروں میں متانت اور ٹھہراؤ کا تاثر ہے۔ شخصیات کا انتخاب بھی ملک کی ذی وقار اور جلیل المرتبت سیاسی و ادبی حوالوں سے کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کے پیش کیے گئے ہیں۔ سحاب کے خاکے سنجیدہ نوعیت کے ہیں جس میں انہوں نے اپنی زندگی کی خوش گوار یادوں کو سمویا ہے اور دور حاضر کے رہنماؤں سے موازنے کے دوران ہلکا سا طنز ان کی تحریر میں در آیا ہے۔ بیگم اکرام اللہ، مس جناح اور بیگم رعنا لیاقت علی خان جیسی فعال کردار شخصیات نے سادگی کو شعار بنا کر آنے والوں کے لیے تاریخ رقم کی اور احساس، ہمدردی اور جدوجہد کو ہر آسائش پر مقدم سمجھا۔

سردار عبدالرب نشتر کا خاکہ 'نشتر صاحب' کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے سردار عبدالرب نشتر تحریک پاکستان کے روح رواں اور قائداعظم محمد علی جناح کے قریبی اور معتمد ساتھیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے وطن عزیز کے قیام

اور سربلندی کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دیں اور مسلماناں برصغیر کو علیحدہ مملکت کا ویژن (Vision) پیش کیا۔ انہی رہنماؤں کی بدولت مسلم لیگ کا نعرہ 'لے کے رہیں گے پاکستان' ہر ایک زبان پر عام ہوا۔ سردار عبدالرب کو شعر و شاعری سے گہرا شغف تھا۔ شاعری میں ان کا تخلص نشتر تھا۔ ان کی شاعری ان کے جذبات کی بہترین عکاس ہے۔[۲۴]

سحاب کے گھر کے ادبی ماحول نے ان کی شخصیت کو بھی جلا بخشی اور اپنے والد بزرگوار کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شاعری کا ذوق ورثے میں پایا۔ نوعمری میں ہی انہوں نے مسلم لیگ کے جلسوں میں اشعار پڑھنے شروع کر دیئے تھے۔ اس حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''سب کو معلوم تھا کہ شائستہ اکرام اللہ ہوں گی تو ہم ضرور کوئی نہ کوئی نظم یا غزل پڑھیں گے اور بلائے جائیں گے۔''[۲۵]

مسلم لیگ نے علیحدہ مملکت کا پیغام پہنچانے کے لیے وسیع تر بنیادوں پر مرد و خواتین کی منظم جماعتیں قائم کیں جن کا مقصد سیاسی بیداری پیدا کرنا اور خواتین کی بڑی تعداد کو مسلم لیگ کا رکن بنانا تھا۔ مسلم لیگ کو وسیع بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے وسائل کا پیدا کرنا بھی نہایت ضروری تھا۔ اس مقصد کے لیے صاحب استطاعت افراد سے مالی معاونت کی درخواست بھی کی گئی اور مسلم لیگ کے جھنڈے بیچ کر بھی اس کمی کو پورا کی کوششیں عمل میں لائی گئیں۔ خواتین کی عملی کاوشوں نے مسلم لیگ کے مقاصد ہر مسلمان عورت تک پہنچانے کی راہ ہموار کی۔ قائداعظم خواتین کی کاوشوں کو ہمیشہ سراہتے اور مردوں کے شانہ بشانہ خواتین کی تحریک آزادی کے لیے عملی جدوجہد کی حمایت کرتے۔ مسلمان خواتین کے گروپوں جن کی قیادت دہلی میں بیگم شریف اور نورالصباح بیگم کرتیں۔[۲۶]

سردار عبدالرب نشتر نہایت شریف النفس انسان تھے۔ پارٹی ورکرز کے ساتھ ان کا رویہ نہایت مشفقانہ ہوتا۔ ایک مرتبہ سحاب اور ان کے گروپ کی دوسری لڑکیاں مسلم لیگ کے جھنڈے بیچ رہی تھیں جب نشتر صاحب نے لڑکیوں کو رات کے وقت پرچم بیچتے دیکھا تو متفکر ہوئے اور انہیں شام دیر تک کام کرنے سے منع کرتے ہوئے فوراً گھروں کو لوٹ جانے کا کہا۔ اسی طرح انہیں وطن کے تقدس اور پرچم کی حفاظت کا احساس سب سے مقدم تھا۔ وہ پارٹی ورکرز کو بھی پرچم کی حفاظت کا درس دیتے۔ اس حوالے سے انہی کے الفاظ میں لکھتی ہیں۔

> ''دیکھو بچیو! کل سے تم لوگ چھ سات بجے تک بیچو۔ اگر کوئی خوشی سے لے، ویسے زبردستی مت تھوپو۔ اس چھوٹے سے پرچم کی عزت کا خیال کرو، ہاں dignity بڑی چیز ہے ملک تم بچوں ہی کے ہاتھوں پروان چڑھے گا۔''[۲۷]

سحاب کے نزدیک ایسے رہنما نئی آنے والی نسلوں کے لیے عملی نمونہ ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں وطن عزیز کے لیے وقف کر دیں اور علیحدہ مملکت کے حصول لیے تگ و دو کی۔ ایسے سچے اور کھرے رہنماؤں کے لیے ان کے دل میں عقیدت کا جذبہ امڈتا نظر آتا ہے اور آج کے صاحب اقتدار افراد کے لیے ان کے انداز میں طنز اور افسوس کا عنصر جھلکتا ہے۔

اس خاکے میں نشتر صاحب کا ایک رخ ہی ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان واقعات سے بحیثیت رہنما ان کے قد اور مرتبے میں اضافہ ہوتا ہے لیکن عام انسانی زندگی کی ہلکی سی جھلک بھی اس خاکے میں نظر نہیں آتی اس لحاظ سے یہ خاکہ نشتر صاحب کی کلی تصویر پیش نہیں کرتا۔

اس کتاب میں چوتھا خاکہ 'بیگم نسیم ولی خان' کے نام سے ہے۔ بیگم نسیم ولی خان عوامی نیشنل پارٹی کی صوبائی صدر اور پارلیمانی لیڈر رہیں۔ بیگم نسیم ولی خان کا خاکہ انٹرویو کی طرز پر مبنی ہے جس میں سحاب ان کی زندگی کے متنوع پہلوؤں جن میں سیاست سے لے کر خانگی امور زندگی کو بھی مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اور ان کے مشرقی و مغربی طرز زندگی کا نقشہ بھی پیش کیا ہے۔ جہاں ایک ہی شخصیت کے دو مختلف اور دلکش پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک طرف بحیثیت رہنما کے اور دوسری جانب بحیثیت عورت اپنے فرائض خوش اسلوبی سے نبھاتی ہیں۔

بیگم نسیم ولی خان، خان عبدالغفار خان کی بہو اور خان ولی خان کی دوسری بیوی ہیں جنہوں نے اپنے خاندان کے مردوں کے دور اسیری میں سیاست کی باگ ڈور سنبھالی اور اپنے حق کے لیے سامنے آئیں۔ وہ پاکستان کے صوبے خیبر پختونخواہ کی پہلی خاتون ہیں جنہوں نے اپنے حقوق کے لیے، اپنے خاندان اور علاقے کے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ بیگم نسیم ولی خان نہایت باہمت اور نڈر خاتون ہیں سیاست میں شمولیت کے حوالے سے وہ بتاتی ہیں۔

> ''ہمارے مرد آہستہ آہستہ اندھیرے کمروں میں چلے گئے۔ گھر میں اندھیرا تھا۔ میرے شہر کے بزرگ آئے اور ایک چادر لائے۔ میں سوچ بھی نہ پائی، مجھے وقت بھی نہ دیا اور تاریخ کی چادر میرے سر پر ڈال دی اور مجھے سیاست کے اسٹیج پر بٹھا دیا۔''[۲۸]

'روشن چہرے' میں شامل خاکہ 'ممتاز حسن صاحب' سحاب کے محسن اور منہ بولے بھائی کا خاکہ ہے جنہوں نے ہر مشکل وقت میں سحاب اور ان کے خاندان کا ساتھ دیا اس لحاظ سے ان کا رتبہ سحاب کی نظر میں بہت بلند ہے۔ ممتاز صاحب سحاب کے حقیقی بھائی نہیں لیکن اس کے باوجود طلاق جیسے کٹھن موقع پر بھی ممتاز حسن صاحب نے حقیقی بھائی کی طرح نہایت بردباری سے سب معاملات طے کیے اور سحاب کا بھرپور ساتھ دیا۔

ممتاز صاحب سحاب کے خاندان کے لیے نہایت قابل احترام اور قابل بھروسہ شخصیت تھے اس لیے وہ ہر لحاظ سے ممتاز صاحب کو ہر معاملے میں فوقیت دیتے۔ یہاں تک کہ زندگی کے اہم امور میں جہاں ان کی موجودگی ناگزیر ہوتی وہاں بھی وہ اپنی ذمہ داریاں ممتاز صاحب کو سونپ دیتے۔ اس حوالے سے لکھتی ہیں

بھائی صاحب نے مجھے لکھا تھا کہ اپنی بیٹی کی شادی میں عین نکاح کے موقع پر سرخوش چپکے سے غائب ہو گئے مجھے بیٹھنا پڑا۔ خط لکھ کر رکھ گئے، بھائی صاحب! میری مدد کریں میں اس تقریب میں نہیں بیٹھ سکتا مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔[۲۹]

پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی ممتاز صاحب کے خاکے کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''سب سے ممتاز خاکہ ممتاز حسن کا ہے کیوں کہ وہ ایک لحاظ سے سحاب کے لیے 'فادر فگر' کا حکم رکھتے تھے۔''[۳۰]

ممتاز صاحب نرم روطبیعت کے انسان تھے۔ انہوں نے ہر رشتے کو مکمل تقدس سے نبھایا حتیٰ کہ اپنی بیوی سے بھی نہایت خلوص اور احترم سے پیش آتے۔ ممتاز حسن کی بیوی خوب صورت نہ تھی لیکن اپنی معاملہ فہمی اور سمجھ داری کے باعث اپنے شوہر کے لیے بہترین رفیق حیات ثابت ہوئیں۔ ممتاز صاحب کی فرمانبرداری کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی دوست کو دعوت پر بلانا ہو تو بھی بیگم سے اجازت طلب کرتے اور یہاں تک کہ بچوں کی فرمائش بھی بیگم کی مرضی کے بغیر نہیں مانتے تھے۔

قرۃ العین حیدر سحاب کی قریبی دوست اور بچپن کی ساتھی تھیں۔ سحاب نے ان کی شخصیت پر خاکہ 'قرۃ العین حیدر' کے نام سے لکھا۔ سحاب کے والد صاحب شاعر اور ادیب تھے اور بھائی آغا سرخوش قزلباش 'چمنستان' رسالے کے مدیر رہے۔ اس حوالے سے ان کے ہاں ادیبوں اور شاعروں کی ادبی نشستوں کا اہتمام ہوتا رہتا اور انہیں نئے قلم کاروں سے روشناس ہونے کا موقع بھی میسر آتا۔ قرۃ العین حیدر سے تعارف بھی ادبی محفل کے انعقاد کے موقع پر ہوا۔ انہوں نے سنجیدہ موضوعات تحریر کیے ہیں۔ ان میں اردو کے ساتھ فارسی اور عربی کے الفاظ بھی ان کی تحریروں میں واضح نظر آتے ہیں اور موضوع کی مناسبت سے خیالات وافکار، زبان اور لب ولہجہ اختیار کیا ہے۔ اس لیے ان کی تحریریں ایک خاص عہد، خاص طبقے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں طنز ومزاح کا عنصر بھی شامل کیا ہے۔

ساحر لدھیانوی کا خاکہ ان کی وفات کی خبر سن کر لکھا گیا ہے۔ اصل نام عبدالحئ، ساحر ان کا تخلص تھا۔ آپ لدھیانہ میں پیدا ہوئے اس نسبت سے ساحر لدھیانوی کہلائے۔ ساحر ہندوستان کے نامور شاعر، جن کی پہلی اور مشہور

تصنیف 'تلخیاں' نے انہیں بام عروج پر پہنچادیا۔ ان کی شاعری خاص وعام میں یکساں مقبولیت کا باعث بنی۔ ۱۲۵ اکتوبر کو جب ساحر کی وفات کی خبر جنگ اخبار لندن میں چھپنے کے لیے آئی تو سحاب کے ذہن میں بیتے وقت کی بہت سی یادیں سمٹ کر آگئیں۔ ساحر جس نے بہاروں کی تمنا کی تھی۔ اس کی وفات خزاں کے موسم میں ہوئی۔ سحاب نے ساحر کے خاکے کا آغاز اس کے سرشار انداز میں کہے گئے اس تمنائی شعر سے کیا۔

ہم نے خزاں کی فصل چمن سے نکال دی

ہم کو پیامِ مرگ بہاروں میں آئے گا [۳۱]

رضیہ سجاد ظہیر کی اچانک موت سے ادبی حلقوں کے لیے ناقابل یقین صورتحال تھی۔ رضیہ سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کی فعال رکن تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہر سجاد ظہیر کی اسیری کے دور میں اپنی پارٹی کی قیادت سنبھالی۔ رضیہ سجاد ظہیر لکھنؤ میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتی رہیں اور بعدازاں دہلی کو اپنا مسکن بنایا۔ رضیہ سجاد ظہیر کمیونزم اور خدا کے وجود سے انکار کا پرچار کرتی تھیں۔ اس حوالے سے افتخار عارف نے سحاب کو بتایا:

> ''رضیہ آپا سے اکثر محفلوں میں ملاقات ہوتی تھی، جن میں وہ پورے خلوص کے ساتھ شریک ہوتی تھیں جبکہ باہر وہ کمیونزم اور خدا کے وجود سے انکار کا پرچار کرتی تھیں اور یہ تضاد ان لوگوں کو خاصا کھلتا تھا جو انہیں ترقی پسند خیالات کی علامت سمجھتے تھے۔'' [۳۲]

رضیہ سجاد ظہیر نے اپنی چاروں بیٹیوں کی پرورش دور حاضر کے معاشرتی اقدار کے مطابق کی اور انہیں ہر قسم کی آزادی دی جو کہ خاندان کی صدیوں کی روایات کے منافی تھی۔ بڑی بیٹی نجمہ ظہیر کے لیے انہوں نے خاندان یعنی سید الطرفین خاندان کو ترجیح دی جبکہ باقی بچیوں کی انہوں نے غیر مسلم گھرانوں میں بھی شادیاں کیں۔ رضیہ سجاد ظہیر نے روایات کا پرچار کرنے کی بجائے ان کے منافی اپنے اصول اور روایات متعین کیے۔ ترقی پسند تحریک کا قیام ہی اردو ادب کی روایات کے منافی تھا۔

رضیہ سجاد ظہیر بحیثیت بیوی ایک وفادار اور باہمت خاتون تھیں جنہوں نے اپنے شوہر کے ساتھ مل کر ترقی پسند تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ رضیہ سجاد ظہیر جہاں ایک طرف خدا کے وجود کی انکاری اور معاشرتی روایات کی مخالف تھیں دوسری طرف مشرقی روایات کی امین بھی تھیں اور انہیں اپنی زندگی کا لازمی جزو سمجھتی تھیں۔

زیر نظر خاکے میں خاکہ نگار کی متعلقہ شخصیت سے ملاقات کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا بلکہ دوستوں سے ہونے والی گفتگو میں ان کی زندگی کے چند پہلوؤں پر جو معلومات میسر آئیں انہیں پر اکتفا کر کے خاکہ لکھ دیا گیا جس سے شخصیت کے خدوخال، عادات واطوار، افکار و نظریات اور رجحانات سے روشناس ہونے کا موقع میسر نہیں آتا۔ اس طرح شخصیت کی ایک دھندلی سی تصویر قاری کے سامنے آتی ہے۔

نظر حیدر آبادی کے خاکے میں سحاب نے ان کی ذاتی زندگی کے مختلف واقعات کو صفحہ قرطاس پر بکھیر کر نظرؔ کی معاشی و معاشرتی زندگی کے رخ سے پردہ اٹھایا ہے۔ وہ شاعر جو دوسروں کو اپنے کلام سے مسرت وانبساط مہیا کرتا ہے۔ اس کے اپنے بچے بھوک سے نڈھال ہونے کے باوجود اپنے باپ کا بھرم رکھے ہوئے ہیں۔ خاکے کا انداز پاس موجود دوست سے گفتگو کا ہے جسے لوگوں پر یقین کرنے سے روک رہی ہیں کہ ان کے فریب میں نہ آؤ جب تم کسمپرسی کی حالت میں تھے، تب بھی کسی کو اس کا احساس نہیں تھا اور انھوں نے کلام کے بدلے کبھی تمہیں کچھ نہ دیا۔

سحاب نے یہ خاکہ نظر حیدر آبادی کی یاد میں منعقد تعزیتی جلسے میں پڑھا اور موجود صاحب حیثیت افراد کو شاعر کی حقیقی زندگی کی تاریکیوں سے روشناس کرا کر اور ان سے التجا کی کہ نظر حیدر آبادی کی تخلیقی کاوشوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کے بچوں کی مالی ضروریات کو پورا کیا جائے اور انہیں ان کے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بنایا جائے۔

للتا احمد کا خاکہ اردو ادب یا شوبز کی کسی شخصیت کا نہیں بلکہ کھانے پکانے کی ماہر خاتون کا خاکہ ہے جنھوں نے اپنے کھانے پکانے کے طریقوں کی انفرادیت اور اپنے ملک کی ثقافت کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ للتا احمد کا تعارف سحاب سے بی بی سی کے توسط سے ہوا۔ للتا احمد بی بی سی پر وگرام میں ہندوستانی کھانے پکانے کی وجہ سے اپنا ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ انھوں نے پہلے پہل آل انڈیا ریڈیو میں کام کیا، اس کے بعد لندن میں بی بی سی کا پروگرام کیا۔[۳۳] للتا احمد نے خاندان کی مرضی کے خلاف اپنی پسند سے مسلم گھرانے میں شادی کی اور اپنے بچوں کے لیے انھوں نے اسلام قبول کیا تاکہ ان کی پرورش اسلامی اصول پر استوار کر سکیں۔

للتا احمد کو شستہ الفاظ میں اردو بولنے پر عبور حاصل تھا۔ الٰہ آباد اور لکھنو سے تعلق ہونے کی بنا پر زبان میں اس کا تاثر رچا بسا تھا۔ للتا احمد کی زندگی مکمل قرینے کا نمونہ تھی۔ اپنے گھر لے جاتے ہوئے اس نے سحاب کو اپنی روزمرہ زندگی کے بارے مکمل کریڈٹ اپنے شوہر احمد کو دیا جو لکھنوی تہذیب کے امین تھے اور اسی رکھ رکھاؤ کو پسند کرتے تھے۔

للتا نے روایتی کھانوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے کھانوں میں جدت بھی پیدا کی۔ ان کے کھانوں کی انفرادیت اور مقبولیت نے انہیں تین کتابوں کی مصنفہ بنا دیا (اب ان کی نو کتابیں ہیں) للتا احمد کا خاکہ ایک وفا شعار اور سگھڑ بیوی کا خاکہ ہے انہوں نے اپنی زندگی کے مختلف ستونوں کو اس طور سے ایک دوسرے کے برابر قائم کیا ہے کہ زندگی ایک عمارت کی صورت میں مضبوط اور پائیدار بنیادوں پر استوار ہوئی۔ للتا نے زندگی کے مشکل دور کو محنت اور لگن سے گزارا اور اپنی کاوشوں سے اپنے لیے راہ ہموار کی۔

کتاب میں گیارہواں خاکہ ہندوستان کی نامور اداکارہ کامنی کوشل۔ اوما کیشپ سے جرمن سفارت خانے کے باہر ملاقات کے تاثرات پر مبنی ہے۔ (اوما کیشپ) کامنی کوشل کے نام سے برصغیر پاک و ہند کی نامور اداکارہ جنہوں نے اپنے دور کی بہترین فلمیں پیش کیں اور مختلف ایوارڈز سے بھی نوازی گئیں۔

کامنی کوشل نے شوبز کی دنیا میں شمولیت کے باوجود اپنی زندگی کو چکا چوند سے باز رکھا۔ انہوں نے اپنی سگی بہن کی حادثاتی موت کے بعد دونوں بھانجیوں کم کم سوہانی اور کویتا سہنی کی خاطر اپنے بہنوئی بی ایس سود سے شادی کر لی، جہاں سے ان کے تین بیٹے ہوئے۔ اومنی کیشپ کا تعلق بنیادی طور پر پاکستان کے شہر لاہور سے تھا۔ تقسیم کے بعد وہ لوگ ہندوستان منتقل ہو گئے۔ اومنی کا تعلق پڑھے لکھے گھرانے سے ہے ان کے والد گورنمنٹ کالج لاہور میں باٹنی کے پروفیسر تھے۔ جب کامنی سات سال کی ہوئیں تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ کامنی اس دور کی واحد اداکارہ تھیں جنہوں نے کنیئرڈ کالج سے انگریزی میں بی اے آنرز کیا۔[۳۴]

ناہید صدیقی پاکستان میں کتھک رقص کرنے والی پہلی خاتون ہیں۔ اس خاکہ میں ان کی پروفیشنل اور عام زندگی کے واقعات بیان کیے گئے ہیں رقص ناہید صدیقی کا اولین مقصد ہے سحاب نے ناہید صدیقی کے بچپن، تعلیم، مشاغل اور رجحانات کو مختصر طور پر بیان کیا ہے۔ کتھک ان کی شخصیت میں رچ بس چکا ہے اسے سیکھنے کے لیے وہ گھنٹوں مصروف رہتی۔

ناہید صدیقی خوبصورت اور دلنشیں آواز کے مالک ضیاء محی الدین کی دوسری بیوی ہیں، جنہوں نے اپنی آواز کے جادو سے اردو ادبی پروگراموں کی تاریخ رقم کی۔ ضیاء محی الدین کو شاعری اور ادب سے گہرا شغف رہا۔ جبکہ ناہید صدیقی کی اولین ترجیح رقص تھی۔ اس ذہنی اختلاف کو ناہید صدیقی زندگی کی بہت بڑی مشکل تصور کرتی ہیں۔

سحاب نہایت حساس طبیعت خاتون ہیں جو دوسروں کی پریشانیوں اور تکالیف کو دیکھ کر تڑپ اٹھتیں اور ان کا قلم واشگاف انداز میں کمزور کی بے بسی کا نوحہ پیش کرتا ہے۔ وہ دوسروں کے غم کو اپنا غم سمجھتی ہیں اور اپنی تحریروں میں اس کا اظہار کرتی ہیں۔ ضیاء محی الدین کی تیسری شادی کی خبر سحاب کے لیے نہایت اذیت ناک تھی بحیثیت عورت وہ ناہید صدیقی کی تکلیف کو بہت قریب سے دیکھتی اور محسوس کرتی ہیں اور مرد کی بے وفائی کا برملا اظہار کرتی ہیں۔

سحاب نے سندھ کے خوبصورت لوک گیتوں کی نمائندہ گلوکارہ پٹھانی بیگم المعروف ریشماں کا خاکہ ان کے ریڈیو دفتر آمد کے ساتھ بیان کیا۔ ریشماں کی پیدائش ہندوستان کے صوبے راجستھان میں ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد ان کے والدین ہجرت کر کے پاکستان کے صوبہ سندھ آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ ریشماں حضرت شہباز قلندر کے مزار پر اپنی آواز کا جادو جگاتی اور اپنے کلام سے لوگوں کے دلوں میں عقیدت کے چراغ منور کرتی۔ ریڈیو پر انہیں متعارف کروانے کا سہرا سلیم گیلانی کو جاتا ہے۔

اس تصنیف کا آخری خاکہ ہندوستان کی گلوکارہ ایرا موئترا کا ہے جو روشن لال ناگرت کی بیوی اور راکیش روشن کی ماں ہیں جن کا خاندان ہندوستان کی فلم انڈسٹری میں نمایاں مقام پر فائز ہے اور اب ان کا پوتا ہریتک روشن نوجوان فلمی ستاروں میں وجیہہ شخصیت اور اداکاری ورقص کے حوالے سے نامور ہے۔ ایرا موئترا سحاب کی بچپن کی ساتھیوں میں سے ہیں جو دہلی میں سحاب کے گھر کے سامنے والے گھر میں رہتی تھیں

ایرا موئترا روشن لال ناگرت سے سنگیت کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں جو آل انڈیا ریڈیو کے اسٹوڈیو نہایت مہارت کے ساتھ مختلف ساز بجاتا تھا۔ ایک دن ازراہِ مذاق اس کے چھوٹے قد کی وجہ سے سحاب کے منہ سے اچانک چھٹنکی نکل گیا اور اس دن سے عرف عام میں اس کا نام چھٹنکی پڑ گیا۔ روشن لال ناگرت ہر ساز کا ماہر مانا جاتا تھا۔ ایرا موئترا کے گھر پر اچانک روشن لال ناگرت کو دیکھ کر سحاب کو بہت حیرت ہوئی۔

سفر نامہ

سحاب قزلباش نے متنوع اصناف ادب میں طبع آزمائی کی۔ انہوں نے افسانہ اور خاکہ نگاری کے علاوہ سفر نامہ نگاری میں بھی اپنی صلاحیتوں سے روشناس کرایا سفر نامہ کی کتاب' **ملکوں ملکوں شہروں شہروں**' ۲۰۰۲ء میں دانیال پبلشرز کراچی سے شائع ہوئی جس میں مصر، لندن، ایران، نائیجیریا اور فرانس کے متعدد مقامات کی سیاحت کا احوال رقم ہے۔ کتاب ضخامت کے لحاظ سے نہایت کم ہے۔ کل ۱۲۱ صفحات میں پانچ ملکوں کی تہذیب وتمدن،

ثقافت، معاشرت، معاشی وسیاسی حالات جیسے چیدہ چیدہ واقعات کا انتہائی مختصر احوال رقم کیا ہے۔ سفر نامے میں صفحات کی تقسیم اس طرح سے ہے۔ مصر کا احوال ۶ صفحات، لندن کے مختلف مقامات اور اسپتال کا احوال ۲۰ صفحات پر مشتمل، ایران میں قیام کے ۱۵ صفحات، نائجیریا میں قیام ۳۲ صفحات اور پیرس کی سیاحت کا احوال ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ سحاب نے بطور سیاح ان ملکوں کا سفر اختیار نہیں کیا بلکہ تلاش معاش اور ضروریات زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ملکوں ملکوں سفر کی صعوبتوں کو سہتی رہیں اور سفر وسیلہ ظفر کے مصداق جہاں رزق کا وسیلہ میسر آیا بلا کسی تامل کے سر بجا تسلیم خم کر کے فرائض سرانجام دیئے وہ اس کوشش میں سرگرداں نظر آئیں کہ:

''اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں''

سحاب نے اپنی زندگی کا پہلا سفر بذریعہ سمندری جہاز پاکستان سے لندن تک کیا۔ سمندری سفر کے دوران ناموافق آب وہوا کے سبب علالت کا شکار ہو کر انہیں مصر میں رکنا پڑا۔ مصر میں قیام کے دوران انہیں نہر سویز، اہرام مصر، ابوالہول کا مجسمہ اور دیگر تہذیب و معاشرت کو قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ مصر کے بلند و بالا پہاڑ، خوبصورت درخت، روشنیوں سے سجے شہر اور مغربی ملبوسات میں خوبصورت خواتین کی خوبصورتی نے انہیں بہت متاثر کیا۔ مصر کے بلند و بالا پہاڑوں کو دیکھ کر ان کی نگاہیں کوہِ طور کو کھوجتی نظر آئیں اور دل و دماغ میں حضرت موسیٰؑ کے اللہ تعالیٰ سے کلام کا خیال سماتے ہی ان پہاڑوں سے عقیدت و محبت پیدا ہونے لگی۔

مصر کی معنویت اس کی ہزاروں سال کی تہذیب پر مشتمل ہے۔ مجسمہ سازی کا فن ان کی خاص پہچان رہا آج بھی موجود مجسمے ان کی تاریخ کا احوال رقم کرتے ہیں۔ ابوالہول کا مجسمہ اور مصر کے بادشاہ فرعون کی عبرت ناک موت کے نتیجے میں بننے والی ممی عظیم الشان مملکت کے عروج و زوال کی داستان پیش کرتے ہیں۔ فرعونوں کی ممی جنہیں مرنے کے بعد کافور وغیرہ لگا کر محفوظ کیا جاتا ہے۔ انہیں دیکھ کر مصنفہ پر خوف و ہیبت کی کیفیت طاری ہو گئی۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے اس جگہ موت کا بسیرا ہو۔

ایران کا سفر مصنفہ نے تلاش معاش کی خاطر ریڈیو زاہدان میں چھ سال کے کنٹریکٹ پر عملدرآمد کرتے ہوئے کیا۔ اس سفر میں مصنفہ نے ایران کی ثقافت، تہذیب و تمدن، لباس، خوراک، زبان سب سے روشناس کرایا۔ فارسی کے مشہور شاعر حافظ و شیرازی کے اشعار کی بازگشت انہیں ایران کی سرزمیں دیکھنے کے لیے کھینچ لائی۔ ایرانی رسم و رواج مشرقی و مغربی تہذیب کا نمونہ تھا خصوصاً خواتین کے پردے کا خاص اہتمام کیا جاتا۔ عورت کو پردے کے بغیر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ سحاب کو بھی دو چادریں تحفتاً پیش کی گئیں جن کا مقصد انہیں ایران کی سرزمین پر انہی کے رسوم و قیود کا پاس رکھنا

تھا۔ سحاب ان کے لباس کا اختلاف دیکھ کر اچنبھے کا شکار بھی ہوئیں۔ سر اور منہ کو چادروں سے ڈھانپنے کا عام رواج جبکہ باقی لباس میں شلوار قمیض کے بجائے انگریزی طرز کی فراک اور موزے پہننے کی آزادی تھی۔

ایران میں تہذیب و تکریم اور اخلاص کا اظہار کرنا خاص وصف ہے۔ بار بار خیریت دریافت کرنا اور حوصلہ افزائی کے کلمات کا استعمال عام ہے۔ مہمانوں کی خاطر تواضع کا خاص اہتمام کیا جاتا بغیر دودھ کی چائے کے ساتھ مصری ڈلیوں سے ہر خاص و عام کی تواضع کی جاتی اور استکان خالی کیے بغیر اٹھنا بھی تہذیب کے خلاف شمار ہوتا۔ ایرانی کھانے کے معاملے میں کافی خوش خوراک واقع ہوئے ہیں۔ بہترین انواع واقسام کے پھل اور چائے ان کی خاص و عام غذا ہوتی۔ سلاد، پنیر اور نان کھانے میں اور پھلوں میں اخروٹ، سردا، تربوز، اور انگور کھانے کے بہت شوقین ہیں۔ چھوٹی الائچی کا بھی بہ کثرت استعمال کرتے ہیں۔

سفر نامہ نگار جہاں بھی جاتا ہے وہاں کے حالات وواقعات، طرز معاشرت اور سیاسی و سماجی حالات کے بارے میں بھی جانکاری حاصل کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں معاشرے پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیتا ہے۔ سحاب بھی سیاسی و سماجی حالات پر گہری نظر رکھتی ہیں۔ نائیجیریا میں تہذیبی بنیادوں پر خانہ جنگی کی کیفیت تھی۔ مسلمان اور عیسائی مذہب کے پیروکار تقریباً برابر تعداد میں تھے۔ مذہبی اختلاف کی بناپر بیافرا کی ایک مسجد میں مسلمانوں کو نماز کے دوران مسجد کا دروازہ باہر سے بند کر کے آگ لگا دی گئی۔ اس سانحے میں تقریباً ۲۰۰ مسلمان شہید ہوئے۔ اسی طرح مسلمانوں کے مذہبی رہنما تفاوا بیلوا کو سازش کے تحت سرعام شہید کر دیا گیا اور ان کی لاش گھنٹوں بے یار و مددگار سڑک پر پڑی رہی۔ ان کی بیوی سردونا کو بھی شوہر کی جان بچانے کی پاداش میں موت کی آغوش میں جانا پڑا۔ اس واقعے سے مسلمانوں کی طرف سے شدید غم وغصے کا ردعمل سامنے آیا اور یوں عیسائیوں کو گھروں سے پکڑ پکڑ کر انہیں عبرتناک سزائیں دی گئیں۔

سحاب ایک دردمند خاتون تھیں۔ دوسروں کی پریشانیوں میں ان کی ڈھارس بندھانا اور حتی الامکان کوشش کر کے دوسروں کو مشکل سے نکالنا ان کا شعار رہا۔ اس کوشش میں انہیں بعض دفعہ خود بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن حساس احساسات کی مالکہ ہونے کی بناپر کسی کو پریشانی میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ وہ مذہبی اختلاف کی قائل نہ تھیں۔ سحاب کے گھر ایک عیسائی لڑکا ایسٹنٹی کام کرتا تھا۔ حالات خراب ہونے کی بناپر سحاب نے اسے فرقہ واریت کے عتاب سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی تاکہ وہ یہاں بچ کر اپنی والدہ تک پہنچ جائے۔

سفر نامے کا آخری حصہ پیرس کی سیاحت پر مشتمل ہے۔ مصنفہ نے وہاں کے تاریخی مقامات شاہراہوں، بلند و بالا عمارات، تہذیب و ثقافت، پھولوں اور سبزہ زاروں کو بیان کیا ہے۔ پیرس کے لوگ نپولین کی یاد میں گھروں کی آرائش تک

میں نپولین کے زیر استعمال اشیاء کے ڈیزائن سے سجاوٹ کرتے ہیں۔ پیرس دنیا کے مہنگے ترین شہروں میں سے ایک ہے اور سیاحوں کی خاص توجہ کا مرکز بھی۔ مصنفہ کو پیرس کے سفر میں پلاس ڈی لا کونکورڈ دیکھنے کا موقع ملا۔ سحاب پلاس ڈی لا کونکورڈ کے میدان میں بنائے گئے مجسموں کی تاریخ سے روشناس کراتی ہیں جہاں پہلی بار انقلاب بادشاہ لوئی شیز دہم کے دور میں آیا۔ اس سے قبل بادشاہی نظام رائج تھا اور عوام کی بدحالی، غربت وافلاس سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا تب فرانس میں انقلاب کی لہر اٹھی جس کے نتیجے میں بادشاہی نظام کو مسترد کر کے بادشاہ لوئی شیز دہم اور ان کی اہلیہ ماری انٹونٹ کے سر قلم کر دیئے گئے۔ اس انقلاب کے نتیجے میں ہزاروں لوگوں نے اپنی جانوں کی قربانی دے کر فرانس میں آزادی وخود مختاری کا پرچم لہرایا۔ پلاس ڈی لا کونکورڈ میں رہنما خواتین کے مجسمے نصب کیے گئے ہیں جو فرانس کے انقلاب کی یاد تازہ کرتے ہیں اور ان کے ساتھ معصوم فرشتہ صفت بچوں کے مجسمے بھی نصب ہیں جو تاریخ کے گہرے راز سے پردہ کشائی کرتے ہیں۔

پیرس کا میوزیم لوغ اپنے اندر کئی صدیوں کی تاریخ رقم کیے اعلیٰ نمونہ ہے۔ سحاب مقامات کو تاریخ کے آئینے میں پرکھتی اور جانچتی ہیں اور قاری کو اس سے روشناس کراتی ہیں۔ میوزیم لوغ کی ابتدا تیرھویں صدی میں ہوئی۔ اس کی تعمیر بہت سے بادشاہوں کے عہد میں جاری رہی۔ نپولین نے بھی اس عمارت کا کچھ حصہ گرا کر اسے نئے سرے سے تعمیر کروایا تھا۔ اس وسیع وعریض عمارت کی تعمیر میں فلپس آگسٹس، ہنری دوم، کرستیناڈی میڈیچی نے مختلف ادوار میں اس کی تعمیر کا کام جاری رکھا۔ اسے بادشاہی محل کے طور پر استعمال کرنے کا سوچا گیا لیکن عملدرآمد نہ ہو سکا۔

بعد ازاں لوئی شیز دہم، لوئی چہارم، ہنری چہارم اور نپولین نے میوزیم میں عجائبات اور نادر نمونوں سے اس کی خوبصورتی میں اضافہ کیا۔ میوزیم تین منزلہ عمارت پر مشتمل ہے۔ ۱۰ اگست ۱۹۷۳ء میں اسے آرٹ گیلری کی شکل دے کر سیاحوں کے لیے کھول دیا گیا۔ عمارت کی پہلی منزل پر مصر، یونان اور روم کے نادر مجسمے رکھے گئے ہیں۔ دوسری منزل پر مصوری اور نقاشی کا حسین شاہکار دیکھنے کو ملتا ہے۔ میوزیم کی چھتوں پر نقش ونگار اور قیمتی فانوس لگے ہوئے ہیں۔ میوزیم میں کرسیاں بھی رکھی گئی ہیں تاکہ کچھ دیر بیٹھ کر ارد گرد کے نظاروں سے لطف اندوز ہو سکیں۔ میوزیم میں رکھا گیا وینس کا مجسمہ جو حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے قبل بنایا گیا۔ ۱۸۰۲ء میں اس مجسمے کا انکشاف ہوا۔ ۶ا فٹ قد کی خاتون کا ماربل سے بنا مجسمہ کٹے ہوئے بازو کے ساتھ جسم پر چادر لپیٹے ایک انداز سے ٹھہری دیوی کا مجسمہ ہے۔ میوزیم کے گراؤنڈ فلور پر موجود نوادرات اور عمارتوں کے ٹکڑے دیکھ کر اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتی ہیں۔:

''جیسے لٹیروں کو ملک جیتنے کے بعد جو بھی حصہ ملک کا ملا وہ اٹھا لائے تاکہ ثبوت رہے فاتح ہونے کا۔''[۳۵]

سحاب ایفل ٹاور کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی اس کی مکمل معلومات فراہم کرتی ہیں۔ ایفل ٹاور پیرس کا ایک خوبصورت سیاحتی مقام 'گسٹوایفٹ' کی تخلیقی کاوش کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ایفل ٹاور ۱۰۵۰ فٹ اونچائی پر مشتمل دنیا کی بلند ترین اور خوبصورت عمارتوں میں سے ایک ہے۔ ایفل ٹاور تین حصوں پر مشتمل ہے جس کا پہلا حصہ ۱۸۷ فٹ، دوسرا ۳۷۷ اور تیسرا ۸۹۹ فٹ لمبائی پر مشتمل ہے۔ یہاں سیاحوں کے کھانے کے لیے عمدہ نظام رائج ہے۔ ایفل ٹاور پر چڑھنے کے لیے سیڑھیوں اور لفٹ دونوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس ٹاور کا کل وزن ۷۰۰ ٹن ہے۔

اسلوبی مطالعہ

سحاب قزلباش نے جب افسانہ نگاری کا آغاز کیا اس وقت پریم چند کی حقیقت نگاری اور سجاد حیدر یلدرم کی رومانیت نگاری کا سحر اپنے اپنے طور پر اثر دکھا رہا تھا۔ سحاب نے رومانویت کی راہ پر چل کر افسانوں میں نوعمر لڑکیوں کی کہانیوں کو بطور موضوع لیا۔ اس دور میں خواتین افسانہ نگاروں میں رومانویت کے موضوع پر لکھنے والیوں میں مسز عبدالقادر، حجاب امتیاز علی، تسنیم سلیم چھتاری، کو شلیا اشک و دیگر شامل تھیں۔ سحاب کی رومانویت نگاری سے وابستگی کے حوالے سے ڈاکٹر عصمت جمیل لکھتی ہیں:

> ''سحاب قزلباش کا افسانوی مجموعہ 'بدلیاں' اور نجمہ انوار الحق کا افسانوی مجموعہ 'پھول کی زبانی' یادگار ہیں۔ یہ تمام افسانہ نگار خواتین رومانوی طرز کو اپنائے ہوئے تھیں۔ ان کے یہاں افسانے میں عورت کا تصور وہی تھا جو رومانوی تحریک سے تعلق رکھنے والوں کا تھا۔''[۳۶]

اس دور کی افسانہ نگار خواتین میں حجاب امتیاز نے منفرد انداز لیے طبقہ امراء کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ حجاب امتیاز علی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پہلی مسلمان پائلٹ خاتون تھیں۔ فن افسانہ نگاری میں بھی انہوں نے منفرد انداز اور سوچ کے در وا کیے۔ ان کی کہانیوں کی عورت بھی اپنے آئیڈیل کی تلاش میں اعلیٰ تعلیم یافتہ، خوبصورت اور پر وقار شخصیت کو اہمیت دیتی ہے۔ ان کے افسانے ایک مخصوص فضا کی عکاسی پیش کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر عصمت جمیل لکھتی ہیں:

> ''حجاب امتیاز علی کی تحریریں رومانوی افسانے کا نقطہ عروج ہیں۔ اجنبیت اور تنہائی کا احساس، ماحول کی طلسمی خوبصورتی، کوئل کی کوک، قالین، پردے، سیامی بلیاں، پائیں باغ، غم زدہ ہیرو اور ہیروئن ان کے افسانوں کا ذو اضعاف اقل ہیں۔''[۳۷]

سحاب قزلباش کے افسانوں میں رومانوی افسانہ نگاروں کی چھاپ نظر آتی ہے۔ انہوں نے مخصوص فضا اجاگر کرنے کے لیے ارد گرد موجود مثالوں سے تاثر اجاگر کیے ہیں۔ ان کے ہاں جذبات کی فراوانی پائی جاتی ہے جو معمولی سے واقعے

کو بھی متاثر کن انداز میں پیش کرتی ہیں۔ان کے افسانوں کے کردار خوبصورتی اور سمجھداری میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتیں۔ روحی، صبیحی، شفق اور عذرا ان کے مرکزی کردار ہیں۔ محبت کی خلش اور فراق کا درد زندگی کا منتہا ہے خوشی و غم کے تاثرات کو اجاگر کرنے کے لیے باغ، پھول، کوئل کی کوک، قالین اور ریشمی پردے امید و ناامیدی کی کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔ان افسانوں میں نوعمر لڑکیوں کے جذبات کی عکاسی ملتی ہے۔ان کے تمام افسانے رومانیت پر مبنی نہیں۔ان میں بعض موضوعات دوشیزاؤں کی ہمجولیوں سے ہنسی مذاق پر مشتمل ہیں۔ان کے ہاں زندگی کی تلخ حقیقتوں کا گہرا ادراک بھی موجود ہے۔

سحاب کے افسانوں کے عنوان کا انتخاب شاعرانہ انداز اور رومان پسندی کی نشاندہی کرتا ہے۔انہوں نے افسانوں میں موضوعات کے مطابق زبان و بیان کا استعمال کیا ہے۔ فلسفیانہ جملے، طویل منظر یہ بیان، اور لمبی چوڑی تمہید یہ سب عناصر ان کے ہاں نظر آتے ہیں۔ محاکات نگاری بھی ان کے افسانوں کا اہم جزو ہے۔انہوں نے رومانویت، تلخ حقائق، نفسیاتی الجھنوں، معاشرتی رویوں، غربت و افلاس اور احساس کمتری جیسے موضوعات کو بیان کیا ہے۔ وہ تشبیہ و استعارے کا بھی بخوبی استعمال کرتی ہیں۔ جس سے ان کے عمیق قوت مشاہدہ کا ادراک ہوتا ہے۔

> ''کتنی خوبصورت آنکھیں تھیں کس قدر دلکش جیسے کسی اطالوی مصور کے شاہکار کی آنکھیں جیسے کسی نے ملائم بھورے چمکدار ریشم کو موتیوں کی آب میں بھگو دیا ہو۔''[۳۸]

افسانہ نگار موضوع کے مطابق اسلوب اختیار کرتا ہے۔ موضوع کی نوعیت کے مطابق الفاظ کا انتخاب، جملے کی بناوٹ، تشبیہ و استعارے کا استعمال سب بقدر ضرورت افسانے کے لیے ضروری ہیں۔ وحدت تاثر اور الفاظ کا انتخاب جس قدر موثر ہوگا افسانے کے محاسن اس قدر انفرادیت کا ثبوت دیں گے۔اس حوالے سے ڈاکٹر سلیم آغا لکھتے ہیں:

> ''اسلوب کی ایک شکل اکتسابی ہے جو مشق سے حاصل ہوتی ہے۔ عموماً صحافیانہ رنگ اس میں جھلکتا ہے اور اس میں خصوصیت کی بجائے عمومیت کا رنگ شوخ ہوتا ہے دوسری شکل ذاتی سوچ اور غور و فکر کے تحت پروان چڑھتی ہے گویا سوچ یا فکر کی گہرائی، جوش بیاں، دروں بینی اور عمیق نگاہوں، لفظوں اور تراکیب کو ایک نئے اور منفرد انداز کے قالب میں ڈھال دیتی ہے اور یہی عناصر باہم مل جل کر ایک جداگانہ قسم کے اسلوب کی بنیاد رکھتے ہیں۔''[۳۹]

سحاب قزلباش منظر کشی کے لیے تخیل اور حقیقت دونوں کی مدد سے جاذب نظر ماحول بناتی ہیں اور فطرت کے حسین مناظر کو جزئیات نگاری سے کام لے کر قاری کی نگاہوں کے سامنے جیتا جاگتا منظر پیش کر دیتی ہیں۔

''کانپتے ہوئے نگینے کے ساتھ میں اکثر چاندنی راتوں میں کانپتی ہوئی ندی کے کنارے کانپتے ہوئے چاند کو دیکھا کرتی تھی۔''[۴۰]

سحاب کے افسانوں میں باشعور لڑکی کا کردار ہے جو مرد کے فریب کو بخوبی سمجھتی ہے۔ افسانہ 'آگ جل رہی ہے' میں مرد کی دوغلی فطرت کی عکاسی یوں بیان کرتی ہیں۔:

''وہ پرویز کیسے -آپا کے سامنے آتے ہی۔۔۔ کیسے بھیگی بلی بنے بیٹھے رہتے ہیں نگاہیں۔۔۔ تک نہیں اٹھاتے ... جیسے ... کچھ جانتے ہی نہیں .... جہاں او جھل ہوئیں اور جیسے کینچلی بدل ڈالی .... رخسانہ خاموش کیوں ہو..... کیا خفا ہو..... تمہارے بال کتنے سنہری اور ملائم ہیں۔''[۴۱]

اسی طرح افسانہ 'ٹوٹا ہوا کھلونا' میں مرد کی فطرت کے بارے روشدی کے الفاظ یوں بیان کرتی ہیں۔

''ہم پیدائشی ایکٹر ہیں۔ اچھے ایکٹر کی تعریف یہی ہے کہ اپنی جان تک خطرے میں ڈالنے کو تیار ہو .... ہر مرد عورت کے سامنے جھک جاتا ہے یہ اس کی فطری کمزوری ہے مگر جانتی ہو۔ یہ سب غلط ہے۔''[۴۲]

افسانہ 'نیلی فراک' میں عذرا کو نواب صاحب کے گھر کام کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے دو آنکھیں متجسس انداز میں اس کی تھکی ماندی حالت کا مشاہدہ کر رہی ہوں جیسے ہی دونوں کی نظریں ٹکراتی ہیں تو نیلی چمکدار نگاہوں میں نیلا سا پردہ بننے لگتا ہے۔ سحاب نے پہلے نیلے سے علامتی تاثر پیدا کیا ہے۔ اس کی عکاسی یوں کی ہے۔

''عذرا کو ایسا معلوم ہوا جیسے نیلی نیلی شفاف سی گہری گہری چمکدار آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ گرم گرم آنکھوں سے دو آنسو نکل پڑے اور نیلی سی چھوٹی سی فراک آنکھوں کی گہرائی میں ناچنے لگی۔''[۴۳]

افسانہ نگار اپنے عہد کا شاہد اور مورخ کہلایا جا سکتا ہے کیونکہ معاشرتی و اقتصادی حالات سے چاہ کر بھی پہلو تہی نہیں کی جا سکتی۔ معاشرتی حالات فرد واحد کی زندگی پر جس طرح اثر انداز ہوتے ہیں افسانہ نگار انہیں اپنے افسانوں میں بیان کرتا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل برٹش گورنمنٹ نے برصغیر کے عوام کو اپنا دست نگر بنا دیا تھا۔ عیسائیت کے پرچار کے لیے تعلیمی اداروں میں ہونے والی سرگرمیوں کا اندازہ افسانہ 'کس کا منہ دیکھا تھا' میں سکول اسمبلی سے لگایا جا سکتا ہے جہاں عربک سکول کی اسمبلی میں نابلد الفاظ کی بازگشت اور چہروں پہ چھائی پژمردگی کا نقشہ یوں بیان کرتی ہیں۔

''یہ عربک سکول ہے بسم اللہ سے دعا شروع ہوئی الفاظ سمجھ میں نہ آتے تھے اور ایک قسم کی ہمنگ تھی گویا ہر لب دوسرے لبوں کے محتاج تھے سہارا ڈھونڈ رہے تھے الفاظ کا۔۔۔ مگر یہ کیا بات تھی کہ ہر

خوبصورت لڑکی کی آنکھوں کے گرد سیاہی کے حلقے کیوں پڑے ہوئے تھے۔ خشک سرخ گیلے کانپتے لب
اور God save the king کانپتی ہوئی حلق سے نکلی ہوئی آوازیں۔۔"[۴۴]

افسانہ 'گولیاں' تجسس سے بھرپور افسانہ ہے۔ افسانے کے آخر میں مصنفہ پاگل کے حقائق سے پردہ اٹھاتی ہیں۔ پورے افسانے میں پاگل کی حرکات و سکنات ایک معمہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور تجسس کا عنصر آخر تک قائم رہتا ہے۔ سحاب افسانے میں کرداروں کے ناموں سے نہیں بلکہ ظاہری حلیے اور حرکات و سکنات سے تشخص اجاگر کرتی ہیں۔ افسانے میں دو کردار باپ اور بیٹی کے ہیں سپاٹ انداز میں تلخ حقیقت کی عکاسی کی گئی ہے۔ پاگل لڑکی کے کردار کو بیان کرتے ہوئے ربط کا سرا کہیں ٹوٹنے نہیں پاتا بلکہ تجسس پورے افسانے کو پڑھ لینے تک قاری کی توجہ بھٹکنے نہیں دیتا۔ افسانے میں پاگل عورت کی حرکات کی عکاسی یوں کی گئی ہے۔

"نہ جانے کیا بڑبڑاتی۔ سینے سے لگائے ہوئے پھولوں کی ہری ٹہنیوں کو زور سے گڑھے میں پھینک دیتی
پھر تیزی سے اس میں مٹی بھرنے لگتی۔ دبا دبا کر محنت سے گڑھا پر دیتی جیسے بہت ہی ضروری کام کر رہی ہو
یہاں تک کہ ایک اونچی سی چھوٹی سی قبر بنالیتی پھر محبت بھری نگاہوں سے اُسے گھنٹوں دیکھتی رہتی۔"[۴۵]

سحاب محاورات کا استعمال بخوبی جانتی ہیں روزمرہ اور محاورات کے استعمال میں برجستہ انداز اپناتی ہیں وہ دور از کار تشبیہات و استعارات کا سہارہ نہیں لیتیں بلکہ دہلی کے روزمرہ محاورے برمحل استعمال کرتی ہیں۔

"خیر سے چار لڑکے ہیں چاروں کے چاروں اللہ میاں کی گائیں شرم میں تو لڑکیوں کو مات کرتے ہیں۔۔۔
ایسے خوبصورت کہ سارے شہر میں چراغ لے کر ڈھونڈو تو بھی نصیب نہ ہوں۔"[۴۶]

سحاب کردار کے موافق اس کا طرز تخاطب اختیار کرتی ہیں کہ شخصیت کا واضح تاثر جھلکنے لگتا ہے وہ کردار کے مطابق لب و لہجہ اختیار کرتی ہیں۔ تانگے والے کے الفاظ یوں بیان کیے ہیں۔

"ناہیں بیگم صاحب ہم بچیوں کو لیجاوت ہیں۔ ہم سچ کہہ رہے ہیں ناک میں دم آجاوت ہے آگے کوئی بیٹھنا
ہی ناچاہے ہے۔۔"[۴۷]

سحاب قزلباش حقیقی زندگی کے واقعات اور اشیاء کو ایک دوسرے سے جوڑ کر نئے معانی تلاشتی ہیں اور تشبیہ و استعارے کی نئی منزلیں تراشتی ہیں وہ معمولی اشیاء سے اچھائی و برائی اور ظاہر و باطن کا تقابل کرتی ہیں۔

"جب انسان کو گناہ کرتے کرتے ہوش آتا ہے تو اس کی حالت سالن کی بھری ہوئی رکابی جیسی ہوتی ہے
جس سے بو آنے لگتی ہے۔"[۴۸]

سحاب جزئیات نگاری پر گہری نظر رکھتی ہیں واقعات کو پیش کرتے ہوئے جزئیات نگاری سے کام لے کر تانے بانے یوں بنتی چلی جاتی ہیں کہ مکمل تصویر قاری کی نگاہوں کے سامنے لا کھڑی کرتی ہیں۔

''چند پتھروں کے ڈھیر کے پاس ایک سیاہ سے گڑھے میں پڑی ہوئی انسانی کھوپڑی جس کے صرف آنکھوں کے دو گڑھے، ناک کے دو ننھے ننھے چھید اور دہانے کا ہیبت ناک گڑھا۔ آنکھوں کے نشان میں سے دو خشک ٹہنیاں جو سیاہی میں کھو گئی تھیں ان کے سروں پر زرد چمپا کے پھول کھلے ہوئے تھے۔''[۴۹]

سحاب کے افسانوں کے کردار یکسانیت لیے ہوئے ہیں۔ انھوں نے افسانوں میں صنف نازک کے احساسات و خیالات کو اجاگر کیا ہے۔ ان کے ہاں کردار اپنے محسوسات اور کیفیات کے اظہار کے لیے الفاظ کا استعمال بہت کم کرتے ہیں بلکہ خاموش طبعی سے زندگی کا بغور تجزیہ کرتے ہیں۔ افسانوں کے تمام مرکزی کرداروں میں ایک جیسی خصوصیات ملتی ہیں۔ محبت اور رقابت کا ٹھاٹھیں مارتا جذبہ، پہلی نظر میں فریفتہ ہو جانے کا تاثر، مرد کا التفات اور عورت کی عدم اعتماد کی کیفیت، محبت میں ناکامی پر قریب المرگ کی صورتحال جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ انہوں نے بادلوں، کلیوں اور موسموں سے دلی کیفیات کی ترجمانی کی ہے۔ سحاب کے ہاں تمام نسوانی کردار حسن کامل کا پیکر اور تصور جاناں میں کھوئے نظر آتے ہیں جبکہ تمام مرد کردار مردانہ وجاہت کے شاہکار اور دل پھینک واقع ہوئے ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات رومانوی ہیں جو کھلنڈری عمر کی عکاسی کرتے ہیں۔ شاعری اور موسیقی کا شغف بھی زیادہ تر کرداروں کا خاصا رہا ہے۔

خاکہ نگاری کرتے ہوئے سحاب نے شخصیت کے ظاہری سراپے، کردار، اخلاق اور ادبی خدمات بیان کر کے شخصیات کے محاسن بیان کیے ہیں۔ انھوں نے شگفتہ انداز میں شخصیات کی زندگی کے مختلف زاویوں کو خاکوں کا موضوع بنایا ہے۔ خاکہ نگار خاکہ لکھتے ہوئے شخصیت سے مکمل غیر جانبداری سے کام نہیں لے سکتیں۔ ہمدردی اور اخلاص ان کے ہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ خاکوں میں شخصیت سے روشناس کراتے ہوئے ان کی ادبی کاوشوں کے ذریعے قدر و منزلت کا احساس دلاتی ہیں۔ جوش کے خاکے میں ان کے عروج و زوال کی تصویر پیش کی ہے۔ ان کی زندگی کے ناموافق حالات اور علالت میں ان کے قریبی اور ہمنوا ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔

جوش سرخ و سفید رنگت کے حامل تھے لیکن زندگی کے آخری ایام میں طویل علالت کے باعث چہرے پر چھائی پژمردگی نے ان کے رنگ روپ کو کملا کر رکھ دیا تھا اور چہرے کی سرخی اور شادابی کو زردی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کو یوں بیان کرتی ہیں:

''اور موتیا کے مرجھائے پھولوں نے آپ کے چہرے کی سرخی چھپالی تھی۔''[۵۰]

سحاب قزلباش کا خاکہ میراجی پر لکھے جانے والے بہترین خاکوں میں شمار ہوتا ہے۔اس خاکے کو ادبی حلقوں میں بے حد پذیرائی ملی۔اس خاکے میں سحاب کا فی البدیع انداز بیاں پایا جاتا ہے۔میراجی کی شخصیت کو پیش کرتے ہوئے ان کا انداز زندہ شخص سے بات کرنے کا ہے۔ میراجی سحاب کو نظم اور غزل کی روایتی پابندیوں سے نکال کر ردیف و قافیے کو ترک کرنے کی ترغیب دیتے۔میراجی خود بھی آزاد شاعری کے علمبردار تھے۔انہوں نے ایک بار سحاب کی ایک نظم کا نہایت مہذب انداز میں مذاق اڑایا۔اس حوالے سے سحاب میراجی کے شعر پڑھنے کے انداز کو اس طرح بیان کرتی ہیں:

> ''ایک مصرع تم نے اپنی موٹی آواز میں دبوچ کر باریک ہونٹوں سے زبردستی آہستہ آہستہ جب میرے تصور کو آزاد کیا تو سچ مچ عین اس وقت میں نے بھی آزادی کا سانس لیا تھا اور بیچارہ شعر تو ادھ موا ہو چکا تھا۔ دل میں میں نے سوچا تھا، کیسی عجیب طرح سے پڑھتا ہے یہ شخص۔''[۵۱]

سحاب میراجی کی شخصیت اور ان کے حلیہ نگاری کی وجہ سے کافی متجسس رہتیں۔ایک دن انھوں نے موقع پاکر میراجی کے دوست وشوامتر سے ان کے بارے میں دریافت کیا تو انہیں بنگالی حسینہ میرا سین کی محبت میں گرفتار ہونے کا انکشاف ہوا۔لیکن سحاب سے بات کرنے کی پاداش میں وشوامتر کی میرا نے کتابوں سے وشوامتر کی جو درگت بنائی وہ سحاب کے لیے حیران کن تھی۔اس کی پوری منظر نگاری انہوں نے بیان کی ہے۔ سحاب نے وشوامتر سے میراجی کے بارے میں ان الفاظ میں استفسار کیا۔

> ''یہ عجیب کارٹون سے حضرت ہیں جب آتے ہیں تو ہر شخص کیسی محبت سے ان سے ملتا ہے۔ن۔م۔راشد اور نظامی صاحب تو گویا ان کے بہت گہرے دوست ہیں پھر وہ سارے ڈرامہ آرٹسٹ میراجی میراجی کرتے عاجز ہیں۔یہ کون سی ہستی ہیں خدا کے لیے بتاجاؤ۔''[۵۲]

میراجی کو ممبئی میں قیام کے دوران نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس وقت ان کے دوست احباب نے ان کی زندگی کی بنیادی ضرورتوں کا بھی خیال نہ رکھا اور اب ان کی وفات کے بعد ان پر لکھ رہے ہیں سحاب میراجی کے لیے درد مندی کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

> ''کئی کئی روز تم بھوکے رہے کئی راتیں تم نے گلیوں سڑکوں پر ٹہل کر گزار دیں۔حلق پیاس سے چٹختا رہا۔ اور جن لوگوں کو تم پر آج کل پیار آرہا ہے کئی صفحے کالے کر ڈالے تم پر۔وہ رات بھر تمہیں دیسی شراب بھی نہ پلا سکے۔ایک وقت کا کھانا بھی نہ کھلا سکے۔''[۵۳]

اس خاکے میں لگتا ہے جیسے ذہن کے پردہ سکرین پر میراجی چلتے پھرتے اور مختلف کام انجام دیتے نظر آرہے ہوں۔ خاکے کی بہترین خوبی بے تکلفانہ انداز میں بات کہہ دینا ہے۔ خاکہ نگار، سوانح نگار کی طرح شخصیت کے تمام پہلوؤں کو احاطہ تحریر میں نہیں لاتا بلکہ چیدہ چیدہ خصوصیات کو تحریر کا حصہ بناتا ہے۔ سحاب نے بھی میراجی کی زندگی کے نمایاں پہلوؤں کو بیان کیا ہے جس سے میراجی کے ظاہر و باطن کی بہترین عکاسی ہوتی ہے۔

ن۔م۔راشد کے خاکے میں ان کی ادبی اور نجی زندگی کے بارے معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ ن۔م۔راشد نے اپنی پہلی بیوی کی وفات کے بعد اپنی چھوٹی بیٹی کی استاد شیلا انجلینی سے شادی کرلی اور اپنی کل جمع پونجی سے لندن میں گھر خرید لیا۔ اعجاز ن۔م۔راشد کے پاکستان جانے پر زور دیتے رہے۔ ان کے خیال میں ن۔م۔راشد کو واپس اپنے وطن، اپنے شہر چلے جانا چاہیے۔ ان کی شاعری چھپنے سے لوگوں کے دلوں میں سوئی ہوئی محبت دوبارہ جاگ اٹھے گی۔ وطن کی محبت اور ماضی کی یادیں راشد کے دل و دماغ میں موجزن رہتیں۔ وہ سحاب سے اکثر اوقات پرانے دوستوں کی باتیں کرتے۔

سحاب میراجی سے مخاطب ہوتی ہیں کہ آپ کہتے تھے راشد حاسد ہے میراجی اور ن۔م۔راشد میں سے کون بڑا شاعر ہے۔ پوچھتا پھرتا ہے۔ آج بھی دوڑ میں بازی لے گیا ہے۔ اور جیت گیا ہے۔ سحاب جلائے جانے کی اذیت کا مشاہدہ کرنے کے لیے جلتے چولہے پر ہاتھ رکھ کر اذیت محسوس کرتی ہیں اور نوحہ کرتی ہیں کہ اگر کسی سے کہوں کہ وہ اپنے ہاتھ جلا کر مشاہدہ کریں تو انہیں اس اذیت کا احساس ہوگا۔

سحاب ن۔م۔راشد کی بیوی شیلا سے ان کے اس قبیح عمل پر بدزن ہو کر سوچتی ہیں کہ پرانی چیزوں کی طرح انگریز بیوی نے شوہر کے وجود سے اپنے گھر کو صاف کر دیا۔ مشرق میں بہار کا موسم خواتین کے لیے بناؤ سنگھار اور بسنت کے اہتمام میں گزرتا ہے جبکہ مغرب میں خواتین اس موسم میں گھر کی تزئین و آرائش کرتی ہیں اور اس میں بعض اوقات سامان کے ساتھ مکینوں کو بھی گھر سے نکال دیتی ہیں۔

ن۔م۔راشد نے صرف شاعری کو ہی اپنا ذریعہ معاش نہیں بنایا بلکہ انہوں نے مختلف محکموں میں ملازمتیں کر کے اپنے خاندان کی کفالت کی ذمہ داریاں نہایت احسن طریقہ سے انجام دی۔ یو این میں انفارمیشن آفیسر کی حیثیت سے انہوں نے ایران، انڈونیشیا اور امریکہ میں خدمات سرانجام دیں۔ ایران میں انہوں نے سحاب کو خط لکھا اور فوجی پروگرام کے لیے اپنی نظم 'آواز' بھیجی۔

سحاب نے فہمیدہ کے لیے پیدا ہونے والی ن۔م۔راشد کی عام مردوں کی جیسی فطری خواہش کا حوالہ بھی نہایت بے تکلفی سے بیان کر دیا ہے۔ جہاں وہ خوبیاں بیان کرتے ہوئے قلم پر پابندی نہیں لگاتیں وہیں وہ خامیوں کو بھی بنا کسی پس و پیش کے راز نہیں رکھتیں اور شخصیت کے بیرونی خول سے اندر کے سطحی سوچ کے حامل شخص کو دریافت کرتی ہیں۔ اس حوالے سے مشفق خواجہ اپنے ادبی کالم میں سحاب کے حوصلے اور بے تکلفی کی داد دیتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں:

> ''واقعے کے آخر میں راشد کے بارے میں شاعرہ کا سہ حرفی جملہ پڑھ کر واقعے کی نوعیت سمجھ آگئی۔ وہ جملہ یہ ہے۔ 'گنجے کہیں کے' جدید اردو شاعری کے گنج خوبی کو گنجا کہنا، کہنے والی کے حوصلے کی بلندی اور طرفین واقعہ کی باہمی بے تکلفی ہے۔''[۵۴]

سحاب اپنی تیز طبیعت اور بے تکلفی کی بنا پر ہر بات فوراً کہہ دیتیں۔ ایک بار راشد صاحب نے سحاب کے سامنے میراجی کو پنجابی میں کہا کہ سحاب کے لیے اچھی شاعری کرو جس سے اس کے دل میں آپ کے لیے لطیف جذبات پیدا ہوں۔ میراجی نے سحاب کے پنجابی زبان سمجھنے کا بتایا تو راشد صاحب کی کھسیانی ہنسی پر سحاب نے فوراً انہیں تلفظ درست کرانے کا طعنہ دے دیا۔ مردوں کے معاشرے میں سحاب کا حالات سے احسن طریقے سے مقابلہ کرنا ان کے کردار کی بلندی کا مظہر ہے۔ اس واقعے پر ن۔م۔راشد نے ایک نظم جس کا عنوان 'مجھے ایک نورس کلی نے یہ طعنہ دیا تھا' لکھی۔ راشد کی وفات کے چند دن بعد شیلا کانپے تلے الفاظ میں خط ملا جس میں ن۔م۔راشد کی نذر آتش کرنے کی خواہش کو اپنے والد کے جلائے جانے کی رسم سے متاثر ہونے کا جواز بتایا جس سے ہائی جینک طریقے سے نہایت کم وقت میں راکھ بن جاتی ہے۔

سحاب اردو ادب کے ان نمایاں کرداروں پر افسوس کرتی ہیں جو گاؤں اور قصبوں سے اپنے علم کے جوہر کو روشناس کر کے مغرب کی صف میں خود کو لا کھڑا کرنے میں سرگرداں ہو گئے اور اپنی پہچان بھول کے غیر تہذیب کا علمبردار بنا دیا۔ ایسے قبیح عمل پر پشیمان ہونے کی بجائے جسم کو ارزاں تصور کرتے ہیں جس کی کوئی ادبی شناخت نہیں صرف ادبی پارے ہی پہچان کا ذریعہ ہیں۔

ن۔م۔راشد کی فاتح خوانی کی رسم ان کے دوست ساقی فاروقی نے اپنے گھر کروائی اور نذر آتش کرتے ہوئے ساقی اور عبداللہ حسین بھی شیلا کے ساتھ تھے۔ سحاب احتجاج کرتی ہیں کہ ساقی نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیوں نہیں کیا۔ اس حوالے سے مشفق خواجہ اپنے ادبی کالم میں لکھتے ہیں:

> ''ساقی کے بارے میں سحاب کی خوش گمانی کا بھی جواب نہیں۔ ساقی تو زندوں کو جلانے سے دریغ نہیں کرتے تو کسی مردے کو جلانے سے کیا بچاتے۔''[۵۵]

اسی طرح انہوں نے حبیب حیدر آبادی کی کتاب 'انگلستان میں' کا حوالہ دے کر ساقی کے افسوس کا منظر پیش کیا جب ساقی نے حبیب حیدر آبادی کو روکا اور کہا:

''اماں یار اور ٹھہرو، راشد کی باتیں کرو، شراب پیو، مٹھائی کھاؤ، راشد صاحب روز روز تو نہیں مریں گے۔''[۵۶]

ن۔م۔راشد کا بات کرنے کا ایک خاص انداز تھا وہ ہمیشہ ٹھہرے ہوئے انداز میں گفتگو کرتے ان کے گفتگو کے انداز پر سحاب لکھتی ہیں:

''لفظوں کو دھیرے دھیرے سیدھی لائنوں میں جماتے تھے۔ آواز کی تہہ میں کہ کہیں بے ترتیب نہ ہو جائیں۔ لفظ اونچے نیچے نہ بیٹھیں۔ لفظوں کی ساخت میں خوبصورتی تھی۔''[۵۷]

۱۹۴۲ء میں ن۔م۔ راشد فہمیدہ حسین کو علیحدہ کمرے میں تلفظ ٹھیک کرواتے جبکہ دوسرے ملازمین کو اندر جانے کی اجازت نہ ہوتی سحاب کو یہ بات قطعی پسند نہ تھی کہ ان پر چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ اس لیے انہوں نے راشد صاحب کو بند کمرے میں تلفظ ٹھیک کروانے سے منع کیا جس پر راشد صاحب نے سحاب کو اصل وجہ بتائی تو وہ انہیں میراجی کے بقول 'حاسد راشد' سے قطعی مختلف لگے۔ میراجی نے فہمیدہ کے بارے میں مکمل معلومات مہیا کیں تو سحاب ان کی شخصیت کا تجزیہ ان الفاظ میں کرتی ہیں:

''چند ہفتوں میں مجھے پتہ لگ گیا کہ اللہ نے ملاحت اور سادگی و پرکاری سے مالا مال کر رکھا ہے۔ اور اوپر کی منزل بالکل خالی ہے۔ اتنی خالی کہ دروازے تک ان کی ہنسی میں چرچراتے سنائی دیتے ہیں۔''[۵۸]

خاکہ نگاری میں مصنف اپنی زندگی کے واقعات بھی پیش کرتا ہے اور اپنے سے متعلق خاکہ کی شخصیت کے ساتھ گزرے ہوئے وقت کی یادوں کو رقم کرتا ہے۔ سحاب بھی خاکے میں شخصیت کے ساتھ مربوط واقعات اور احساسات کو خود سے علیحدہ نہیں کر پاتیں۔ وہ فیض صاحب کی شخصیت کے ہر پہلو کا باریک بینی سے مطالعہ کرتیں اور دوسرے چاہنے والوں کی طرح ان کے عادات واطوار اور قول و فعل کو اپنی زندگی کا اثاثہ تصور کرتیں۔ سحاب کی سوچیں نوخیز کلی کی سوچیں تھیں۔ جن میں نوجوانی کے نوخیز جذبوں کی حدت جھلکتی ہے اور بعض جگہ پر لاابالی پن بھی نظر آتا ہے جو ان کی نوعمری کی نشاندہی کرتا ہے۔ فیض صاحب سحاب کے لیے ایک مکمل آئیڈیل کا درجہ رکھتے تھے اور اس آئیڈیل سے انہوں نے دل ہی دل میں توقعات بھی وابستہ کر لیں۔ اسی لیے جب فیض صاحب کے گھر میں ایلس فیض کو دیکھ کر انہیں اداسی اور پچھتاوے کا احساس ہوا۔ سحاب اس حوالے سے ایک متضاد کیفیت کا فقرہ رقم کرتی ہیں جس سے ان کی بات کا مبہم پیرایہ تشکیل پاتا ہے۔ فیض

صاحب کے حوالے سے لطیف جذبات رکھنے کے باوجود ایلس فیض کو دیکھ کر انہیں فیض پہلے سے بھی زیادہ اچھے لگے۔ مشفق خواجہ سحاب کی ہمت کو داد دیتے ہیں اور ان کے اس فقرے کو پکڑ میں لے کر کہتے ہیں:

''سحاب کی ہمت قابل داد ہے۔ کہ اس دن انہیں پہلے کے مقابلے میں فیض زیادہ اچھے لگے حالاں کہ ایسے موقعوں پر زہر لگنے والا فقرہ استعمال کیا جاتا ہے۔''[۵۹]

ایلس فیض لندن میں پیدا ہوئیں اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۸ء میں آپ ہندوستان آئیں اور بعد ازاں ۱۹۴۱ء میں فیض صاحب سے آپ کی شادی ہوئی۔[۶۰] سحاب پاکستانی عوام کے منفی رویوں کی عکاسی اکثر و بیشتر اپنے خاکوں میں کر دیتی ہیں۔ فیض صاحب کے خلاف حکومت اور عوام کی جانب سے ایسے رویے کی طرف اشارہ کرتی ہوئے لکھتی ہیں:

''جیسا کہ ہمارے عوام کا مزاج اور قاعدہ ہے۔ کہ کچھ سالوں کے بعد ہر حکومت سے خفا ہو کر اس کا بھرکس نکالنے کے لیے میدان تیار کر لیتے ہیں اور ہمارے اخبار اور پریس اگر کسی شاعر اور نغمہ نگار یا گلوکار یا کسی سیاسی ہستی سے خفا ہو جائیں تو اس کے آباؤاجداد کے سارے برے کاموں کی فہرستیں تیار کر لیتے ہیں۔''[۶۱]

خاکہ 'عصمت آپا' میں سحاب عصمت چغتائی کی شخصیت، سراپا، مزاج اور کردار کی بلندی کی پرتیں کھولتی چلی جاتی ہیں۔ سحاب شخصیت کا بغور جائزہ لیتی ہیں اور اپنے مشاہدے کو بہترین انداز میں بیان کرتی ہیں عصمت چغتائی کے سراپے کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''بلا کا ذہین چہرہ جس سے ہر انسان مرعوب ہو جاتا۔ ہاتھ پیر کسی جفاکش انسان کے جڑے ہوئے تھے۔ عورت کے ناطے سے ہاتھ پیروں کی ساخت نہ تلوے نہ ہتھیلیوں میں عورت پن چھو کر بھی نہیں گیا تھا۔''[۶۲]

عصمت چغتائی نہایت زیرک اور قابل فہم خاتون تھیں۔ جنہوں نے زندگی کی مختلف جہات میں عورت کی طرح سے نہیں بلکہ مردوں کی طرح مضبوطی اور ثابت قدمی سے حالات و واقعات کا سامنا کیا۔ انہوں نے خاندان اور رسم و رواج سے بغاوت کر کے اپنے لیے نئی راہیں تراشیں اور ادب کو صنف نازک کے لطیف احساسات سے روشناس نہیں کرایا بلکہ ضروریات زندگی کی محرومیوں و ناآسودگیوں سے بھی بہرہ ور کیا۔ عصمت کے مزاج میں تندی و تیزی کا عنصر غالب تھا جب کسی موضوع پر بولتیں تو اپنی گفتار اور ٹھوس دلائل سے سامع کو باآسانی قائل کر لیتیں۔ مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ مختلف ثقافتوں اور مذاہب کا مطالعہ کرتی رہتیں۔ ان کا کل وقتی مصرف مطالعہ ہی رہتا۔ اس کے علاوہ اپنے قریبی جاننے والے کو

ہپناٹائز کر کے ان کے بارے مکمل آگہی حاصل کرنے کا فن خوب جانتی تھیں۔ سحاب ان کی اس عادت کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''عصمت آپا کو نئے تجربے کرنے میں بہت لطف آتا تھا۔ یہ مجھے چار پانچ دن میں ہی پتہ لگ گیا تھا۔ 'آؤ بہن برائی کریں' ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ پھر کہانیاں در کہانیاں نکالنا۔ فلسفہ اور نفرت کے پہلوا جاگر کرنا۔ اسی راستے دلوں میں چپکے سے گھس جاتیں۔ observation کمال کا اللہ میاں نے بخشا تھا۔''[۶۳]

سحاب نے بے تکلفی کی راہ عبور کی تو انہیں خود اپنے قیمتی اثاثے اور زندگی کے نہاں خانوں کو باآسانی عیاں کرنے میں عصمت آپا نے کس مہارت سے کام لیا کہ سحاب ایک بے بس کی طرح سب راز اگلتی چلی گئیں لکھتی ہیں۔:

''میں ہر گز بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ میرے سارے راز مجھ سے اگلوائیں بہت کوشش کی مگر سینکڑوں دروازوں سے وہ چپ چاپ چلی آتیں چمکارتی ہوئی لڑتی ہوئی اور تجربوں کی پوٹلیاں کھولتی ہوئی اور میں اپنے آپ کو آخر کار ایک حقیر فقیرنی لگنے لگی۔ میری ساری دولت میرے راز میرے شکوے جو میں نے مخمل جیسی مسکراہٹ میں لپیٹ کر رکھے تھے وہ سب چھین لیے اور جواباً کہا کہ کس چیز پر اتراتی ہو تم۔۔''[۶۴]

سحاب کی قوت مشاہدہ بہترین ہے۔ وہ شخصیت کا کلی جائزہ لیتی ہیں اور شخصیت کے ظاہر و باطن کو غیر جانبداری سے بیان کرتی ہیں۔ عصمت چغتائی تنک مزاج تھیں وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتیں۔ ان میں حس مزاح بھی کمال درجے کی تھی۔ نہایت شستہ مزاج رکھتیں۔ بڑی سے بڑی بات کر کے بھی ہلکا سا مسکرا کر تبسم بکھیرتیں اور سیدھے سادے انداز میں بہت پتے کی بات کر جاتیں کہ سامنے والا ان کے قوت مشاہدہ اور حس مزاح کی داد دیئے بنا نہ رہ پاتا۔ قیام پاکستان کے بعد پنڈت نہرو کی تقریر کے حوالے سے ایک واقعہ رقم کرتی ہیں جب سحاب اور عصمت چغتائی نے جلسے میں ایک ساتھ شرکت کی تو ان کے خیالات جاننے کا موقع ملا۔

''پنڈت جی کہہ رہے تھے کہ ہمارا ایک کلچر ہے۔ ہم سب ایک ہیں۔ ایک بات چیت کا طریقہ ہے۔ رہن سہن ایک ہے۔ سب کچھ ایک ہے۔ لوگوں کے بھرے لمبے چوڑے ہال میں ایسی خاموشی تھی کہ عصمت آپا نے سرگوشی میں سر جھکا کر کہا۔ "بالکل غلط صبح ہی صبح غسل خانے میں جاؤ تو کلچر مختلف ہوتا ہے ہمارے لوٹے کی ٹونٹی ہوتی ہے۔ اور ان کا لوٹا بغیر ٹونٹی کے ہوتا ہے۔''[۶۵]

خدیجہ مستور نے پنجاب کی تہذیب و معاشرت میں رہ کر بھی پنجابی لباس کو نہ اپنایا بلکہ ہمیشہ ساڑھی میں ملبوس رہیں۔ اس حوالے سے طفیل احمد اور خدیجہ مستور دونوں کے شکوؤں کو بیان کیا ہے۔ طفیل احمد پنجاب کی رہنے والی کو پنجابی

لباس یعنی شلوار قمیض نہ اپنانے پر شاکی رہے جبکہ خدیجہ کو یہ قلق رہا کہ پنجاب کی بن کر بھی وہ ہمیشہ مہاجر ہی کہلائیں۔ سحاب خدیجہ کی درد مندی اور محبت کی قائل نظر آتی ہیں۔ ان کی شخصیت اور ادبی مرتبے کے حوالے سے یوں رطب اللسان ہوتی ہیں۔

''خدیجہ کو سب کے دکھ دھکیل کر لے گئے ورنہ وہ تو ہنستا چہرہ۔ کھلی کھلی آنکھوں والی، موتیا کے پھول بالیوں میں پہننے والی لڑکی تھی، جو بچپن ہی سے قلم کی نوکوں سے جوہی، موتیا کے پھول ننھی ننھی لڑکی بالیوں کی داستانوں سے پروتی رہتی۔ وہ چاہتی تھی ہم سب کے غم اب جوہڑ میں کھلے کنول بن جائیں۔''[۶۶]

خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور سے پہلی ملاقات ریڈیو سروس کی وساطت سے ہوئی۔ لکھنؤ مشاعرے میں سحاب نے ان بہنوں سے ملنے کے اشتیاق میں شرکت کی۔ پہلی ملاقات کے تاثرات یوں بیان کرتی ہیں۔

''سفید لٹھے کے پردوں میں گھرا ہوا چکوں سے ڈھکا ہوا کمرہ یاد ہے۔ لمبی سی مانگ لیے چنے ہوئے دوپٹوں میں دبلی پتلی چمکدار آنکھوں والی سانولی سلونی لڑکیاں جن کے چکنے چپڑے بال تیل سے چمک رہے تھے۔ خدیجہ اپنا چہرہ بڑی بڑی آنکھوں سے ڈھکے ہوئے تھی۔''[۶۷]

جمیلہ ہاشمی سے سحاب کی پہلی ملاقات لندن میں ہوئی تو اس نوبل انعام یافتہ ذی فہم ادیبہ کی سادگی دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ جمیلہ ہاشمی نے چھینٹ کی شلوار قمیض کے ساتھ سفید رنگ کا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا اور بالوں کا جوڑا بنائے ہوئے عام گھریلو خاتون کی طرح لگ رہی تھیں۔ سحاب واقعات کو بیان کرتے ہوئے جزئیات نگاری سے کام لیتی ہیں۔ جمیلہ ہاشمی کے انداز تکلم کے حوالے سے بتاتی ہیں۔

''وہ بات کرتے کرتے چپ ہو جاتی ہے جیسے کوئی بات ابھی یاد کر کے بتائے گی اور آپ اس کی یادداشت کا سرا ڈھونڈنے چل پڑتے ہیں اندھے راستوں پر۔''[۶۸]

جمیلہ ہاشمی نے ناول میں تشبیہات اور قدرتی مناظر کے ذریعے سچی کیفیات کو پیش کیا۔ اس حوالے سے چند مثالیں پیش کر کے ان کے ندرت انداز کو سراہتی ہیں۔ خدیجہ مستور اور جمیلہ ہاشمی کے خاکے تعارفی نوعیت کے ہیں جن میں ان کی ادبی کاوشوں کے حوالے سے ان کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ دونوں مصنفہ کے مزاج، عادات واطوار، رہن سہن اور ان سے قریبی دوستی یا جانکاری کا تاثر واضح اجاگر نہیں کیا گیا ایک واجبی سی ملاقات کی بنیاد پر خاکہ لکھنے سے شخصیتوں کے بارے تشنگی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر بشیر سیفی اچھے خاکے کی خوبیاں بیان کرتے ہیں۔

''اچھے خاکے کی خوبی یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اس میں شخصیت کے روشن وتاریک دونوں پہلوؤں کی جھلک دکھائی جائے ورنہ پیش کردہ قلمی تصویر یک رخی قرار پائے گی کیونکہ انسان نہ اچھائیوں کا مرقع ہے نہ برائیوں کا۔''[۶۹]

نخشب سحاب کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتے تھے۔انھوں نے انور بائی کے ہاتھ پیغام بھجوایا۔اس حوالے سے نخشب کو موردالزام ٹھہراتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''اصل میں تم خود ذمہ دار ہو۔خود دور کھڑے رہے اور انور بائی مرحومہ سے جسے تم چاہتے تھے رائے پچھوائی۔میری وہی رائے تھی جو انور بائی کے دل کو پسند تھی۔تم نے سوچا عورت عورت کو بتادیتی ہے راز۔۔۔میں تو عورت کم خود سر زیادہ۔مجھے اس زمانے میں بھاگنے کی عادت تھی۔''[۷۰]

سحاب سراپانگاری نہایت باکمال انداز میں کرتی ہیں۔انور بائی کی سراپانگاری یوں بیان کرتی ہیں۔

''نازک سی۔چناہوادوپٹہ پہنے۔ہیرے کی چمک آنکھوں میں چھپائے جب وہ اسٹوڈیو میں آئی تو مجھے لگا کہ ایسی نوخیز کو دیکھ کر میر نے کہاہوگا ''

'' پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے۔۔''[۷۱]

سحاب کو محاوروں پر خاص عبور حاصل تھا۔موقع و محل کے اعتبار سے محاورے لکھ دیتیں۔جس سے ان کی زبان پر قادرالکلامی عیاں ہوتی ہے۔جیسے

''طاقت مہماں نہ داشت''[۷۲]

''جواب جاہلاں باشد خموشی''[۷۳]

''کسی نے کہاوہ تو ایسے چلے ہے کہ بتاشے بھی نہ ٹوٹیں۔''[۷۴]

اس طرح نخشب کے ظاہر و باطن کی تصویر یوں پیش کرتی ہیں۔

''خشب اپنے بنائے ہوئے خول میں اندر ہی اندر مرجھارہا تھا۔پیسے کے ڈھیر۔محبت کی پیاس وہ دنیا کی دوڑ میں بھاگ رہا تھا۔ہانپ رہا تھا۔ریس کورس میں ہار جیت کے امتزاج میں اپنے شب وروز سرکاتا جارہا تھا۔تنہائیوں میں یادوں کے خزانے کھولے بیٹھتا تو تلخیاں ہی تلخیاں ہی نظر آتیں۔اپنے دربار کی مجلس میں کھوکھلے قہقہے لگاتا۔''[۷۵]

بیگم شاہنواز کی عالی ہمتی کا ثبوت عین جلسے کے دن بیٹی کی وفات پر شکوہ کناں ہونے کی بجائے جس درجہ صبر سے کام لیا اس کی عینی شاہد ہو کر سحاب نے اس واقع کو یوں بیان کیا ہے۔

''بیگم شاہنواز کی صاحبزادی جو اس زمانے میں عورتوں کی پہلی پائلٹ تھیں اور شاعرہ بھی تھیں ان کا اس دن کریش ہوا اور اس جلسے میں بیگم شاہنواز۔۔۔ایک پسندیدہ لیڈر کی آنکھوں میں پہلی دفعہ آنسو دیکھے۔اپنی بیٹی کی موت پر خاموش آنسو بہاتی رہیں اور پھر ایک بہترین اور جوشیلی تقریر کی۔''[۷۶]

اس خاکے سے بیگم شاہنواز کی حب الوطنی زندگی کے دیگر امور پر حاوی اور مقدم نظر آتی ہے جن کا مقصد حیات مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کا حصول ہے۔

بیگم رعنا لیاقت علی خان نے زندگی کو بہترین انداز میں گزارنے اور اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور اس کے ساتھ گھریلو امور بخوبی انجام دینے کا بھی سبق دیا۔ سحاب دور حاضر کے قائدین پر چوٹ کرتی ہیں۔

''اس زمانے کی لیڈر مائیں کبھی بھی تیس تیس ہزار کا لباس نہیں پہنتی تھیں۔ ملک کو مقروض کرنے میں آج کل کی غلط تقلید نے حصہ لیا۔ عورت کا حسن کپڑوں سے نہیں، ذہنی جلا سے نکھرتا ہے قناعت سے پھلتا پھولتا ہے۔''[۷۷]

اس خاکے کا انداز بیانیہ ہے۔ سحاب نے سلیس اور سادہ انداز بیان سے اس دور کی خواتین کی کاوشوں اور صلاحیتوں کو اجاگر کیا ہے۔ جنہیں بیان کرتے ہوئے تسلسل اور روانی بیان میں کہیں بھی فرق نہیں آیا۔ سحاب ماضی کی یادوں میں کھو کر بعض اوقات خوشی سے سرشار ہو جاتی ہیں اور بعض جگہوں پر آبدیدہ نظر آتی ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے الفاظ میں کہیں لغزش نہیں آتی۔ الفاظ کہیں ڈگمگاتے اور دم نہیں توڑتے بلکہ خوشی اور غم کے امتزاج کو پڑھتے ہوئے قاری خود کو انہی واقعات کا شاہد محسوس کرتا ہے۔ خواتین رہنماؤں کی کاوشیں ہوں یا تحریک آزادی کے متوالوں کی جوش و خروش سے نغمے گاتی لڑکیوں کی ٹولیاں، کہیں بھی انہوں نے قلم کو روکا نہیں بلکہ ایک واقعے کو دوسرے واقعے کے ساتھ تسلسل سے پیش کیا۔ جیسے ایک منظر دوسرے منظر کے ساتھ باہم مربوط ہو اور اگر کہیں ایک منظر کو بیان کیا گیا اور دوسرے کو نظر انداز تو تحریر میں وہ چاشنی اور سرور نہ رہے گا جو خاکے کی اصل خوبی ہے۔

سردار عبدالرب نشتر کا خاکہ 'نشتر صاحب' میں ان کے خدوخال کے حوالے سے مختصر طور پر یوں بیان کرتی ہیں:

''نشتر صاحب ہم کو بڑے عزیز تھے کہ وہ ہمارے جلسے جلوس میں اکثر بڑی بڑی مونچھوں اور خوبصورت چہرے کے ساتھ موجود ہوتے تھے۔''[۷۸]

سحاب کے لیے براہ راست ملاقات میں بیگم ولی خان ٹی وی پر خطاب کرتی اور صحافیوں کو اپنے دلائل سے زیر کرنے والی شخصیت سے نہایت مختلف، خالص مشرقی عورت کا انداز اور رویہ ایک مکمل گھریلو عورت کی زندگی کا عکاس تھا سحاب کی ان سے ملاقات لندن کے ایک شاپنگ مال میں ہوئی اس حوالے سے لکھتی ہیں۔

> ''آپ اسپینش یا اٹیلین خاتون اپنے گرے براؤن سوٹ میں لگ رہی تھیں۔ سر پر چھوٹی سی چٹیا کو اوپر باندھ کر آپ بالکل اٹیلین ہاؤس وائف لگ رہی تھیں۔ جو برٹش ہوم میں اپنے بچوں کے لیے سستی سے سستی بارگن ڈھونڈ رہی ہو۔''[۷۹]

خاکہ نگار کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس شخص کا خاکہ لکھا جارہا ہے۔ اس کی بھرپور شخصیت اور افکار و نظریات سے واقفیت کرائی جائے۔ سحاب نے اپنے خاکوں میں متعلقہ اشخاص کی زندگی کی امنگوں کو بھی بیان کیا ہے۔ بیگم نسیم ولی خان بحیثیت لیڈر عوام کے رویے سے نالاں ہیں۔ سحاب شخصیت کی خامیوں کو نہیں جانچتیں بلکہ شخصیت کے بطون میں اتر کر ایک پروفیشنل اور عام انسان کی زندگی کا موازنہ کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک شخصیت کا باطنی حسن اس کی نرم دلی، ہمدردی اور وفاداری پر ہے۔

خاکہ نگار ہمیشہ ایسی شخصیت کو خاکے کے لیے منتخب کرتا ہے۔ جسے قریب سے دیکھا ہو اور اس کی عادات واطوار، مزاج، افکار و نظریات سے شناسائی حاصل ہو اور ساتھ ہی اس شخصیت سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ہونے کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے، جس کی بنا پر خاکہ نگار اپنی سوچ اور نظریات کو پیش کرتے ہوئے خاکہ تحریر کرتا ہے۔[۸۰]

ممتاز حسن صاحب کو ادب اور شاعری سے بہت شغف تھا۔ خود بھی کتب کا مطالعہ کرتے اور کتب ذخیرہ بھی کرتے تھے۔ انہی کے طفیل کراچی کے کتب خانوں میں نایاب کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے اس کے علاوہ ادبی محفلوں میں شرکت کرتے اور مختلف شعرا کے کلام سے مہمانوں کو محظوظ کرتے۔ انہیں فارسی شعر و ادب سے گہرا شغف تھا۔ محفلوں میں فارسی کے نامور شعرا کے کلام پر دل کھول کے داد دیتے جس سے ان کے ذوق جمال کا بخوبی اندازہ ہوتا۔

قرۃ العین حیدر کے خاکے میں ان کے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے جو پہلا تاثر ان کے ذہن میں پیدا ہوا اسے یوں لکھتی ہیں۔

> ''وہی ذہین خوبصورت چہرہ جو کتابوں میں چمکتا نظر آتا تھا۔ کالے گھنے بالوں میں گھرا ہوا چمپئی گول چہرہ، بادام جیسی بڑی بڑی کاجل میں رچی چمک دار آنکھیں، دبلی پتلی سی، کالی ساڑی میں غنچہ ذہین لڑکی جو بار بار

اپنے بال گردن کے خم سے ہلاتی اور وہ لچک کر رخساروں تک آجاتے، ہنستی تو چمک دار دانت سرخ ہونٹوں سے نظر آنے لگتے۔"[۸۱]

تحریر شخصیت کی بہترین عکاس ہوتی ہے۔ مصنف کی زندگی اس کی تحریروں میں پنہاں ہوتی ہے۔ اس کی سوچ، خیالات وافکار، تفکرات، ہمدردی، رحم دلی، پسند ناپسند، رجحانات سب سے شناسائی ہوتی ہے۔ اس لیے کسی مصنف کو سمجھنے کے لیے اس کی تحریروں کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ قرۃ العین حیدر کی تحریروں کے حوالے سے بیان کرتی ہیں۔

"عینی کی چیزیں جب پڑھتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ وہ مجھ سے باتیں کر رہی ہے۔ آپ سے باتیں کر رہی ہے، دوسروں کے دکھ، ملکوں، قوموں کے دکھوں میں اپنے ملک کے غم وہ سب سے اوپر رکھتی ہے۔ کبھی نہیں بھولتی۔"[۸۲]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر میں وطن سے محبت اور ایثار کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ قرۃ العین حیدر کی تحریریں متنوع موضوعات پر مبنی ہیں۔ جن میں زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے اشخاص، رویوں، رجحانات اور عہد کو سمو دیا گیا ہے۔ انہوں نے سنجیدہ موضوعات تحریر کیے ہیں۔ ان میں اردو کے ساتھ فارسی اور عربی کے الفاظ بھی ان کی تحریروں میں واضح نظر آتے ہیں اور موضوع کی مناسبت سے خیالات وافکار، زبان اور لب ولہجہ اختیار کیا ہے۔ اس لیے ان کی تحریریں ایک خاص عہد، خاص طبقے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں طنز ومزاح کا عنصر بھی شامل کیا ہے۔ سحاب ان کی تحریروں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی شخصیت اور سوچ کو مد نظر رکھتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے اپنی تحریروں میں ہمیشہ جدت انداز اور ندرت بیان سے کام لیا۔ ان کی تحریریں لگے بندھے تشبیہات واستعارات کے سہارے پر استوار نہیں ہوئیں بلکہ افکار وخیالات کو نئے سانچے میں ڈھال کر مختلف طرز تحریر کو روشناس کرایا۔ مصنف کا کام کسی واقعے کو لے کر اس کی ہو بہو تصویر پیش کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ تحریر میں چاشنی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب خیالات میں ندرت پائی جائے۔ غالب کی وجہ شہرت اس کے کلام میں معنویت اور نادر تشبیہات واستعارات کا استعمال ہے انہوں نے نہایت سلیس اور غیر مبہم انداز میں افکار پیش کیے جو آج بھی اردو ادب میں اپنی مثال آپ ہیں۔ سحاب نے قرۃ العین کی نادر تشبیہات کو ان کی تحریر سے منتخب کر کے تصدیق ثبت کی ہے لکھتی ہیں۔

"راستے کے دونوں جانب تالابوں میں سرخ کنول کھلے ہوئے تھے۔ پونم کا چاند بھی گنگا نہا کر نکلا تھا اس کی چندیا پر جیسے چند آبی پتے چپک سے گئے۔ سردی کے مارے وہ پیلا پڑ گیا تھا۔ یہ نظر کا دھوکا تھا۔ گاہے وہ کہرے کی لوئی اوڑھ لیتا گاہے اونچے درختوں سے دکھلائی دے جاتا۔"[۸۳]

چاند نکلنے کے منظر کو گنگا یعنی ہندوستان کا متبرک دریا جہاں ہندو نہا کر خود کو گناہوں سے پاک تصور کرتے ہیں۔ یعنی چاند اس طرح پاک صاف ہو کر نکلا اور چاند پر دھبے کو گنگا کے آبی پتوں کے چپکنے سے تشبیہ دی گئی ہے اور ہلکی مدہم سفید روشنی کو سردی کا اثر بیان کیا گیا ہے کبھی چاند سردی کی چادر اوڑھ لیتا یعنی بادلوں میں خود کو چھپا لیتا اور کبھی درختوں سے نظر آنے لگتا۔ قرۃ العین حیدر نے چاند کو مکمل طور پر مختلف انداز سے پیش کیا ہے چاند کے نہانے کا تاثر مکمل طور پر انفرادیت لیے ہے۔

مصور کا کام رنگوں سے کینوس پر نقوش بنا کر رنگ بھرنا ہے جبکہ ادیب کا کام الفاظ کی بنت سے نقش واضح کرنا ہے کامیاب لکھنے والا وہ ہے جو اپنی تحریر سے جیتی جاگتی تصویر پیش کر سکے۔[۸۴]

خاکہ نگار شخصیت پر ٹھہرے ملمع کو کھرچ کھرچ کر اس سے اصل خدوخال باہر نکالتا ہے اور ملمع لگی خوبیوں کو اندر چھپی خامیوں اور کمزوریوں سمیت پیش کرتا ہے۔ خاکہ نگار کا کام اس پر محتسب کی طرح رائے قائم کرنا نہیں ہوتا لیکن خامیوں پر پردہ ڈالنا بھی ہر گز بہترین خاکہ نگاری کے زمرے میں نہیں آتا۔ اس لیے جو شخص جس طرح نظر آتا ہے اور جس طرح خاکہ نگار مشاہدہ کرتا ہے اسے قاری کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اس میں کافی حد تک مصنف کی سوچ کا عمل دخل بھی ہوتا ہے اس لیے ہر خاکہ نگار ایک ہی شخصیت کو مختلف انداز میں چانچتا، پرکھتا اور پیش کرتا ہے۔[۸۵] سحاب اپنا اور قرۃ العین حیدر کا موازنہ کرتی ہیں اور سوائے چند ایک خصوصیات کے باقی ہر لحاظ سے انہیں خود سے یکسر مختلف پاتی ہیں۔ شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ قرۃ العین حیدر میں قوت ارادی کی کمی محسوس کرتی ہیں جو کوئی بھی فیصلہ کرتے ہوئے ہچکچاتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کی تحریریں ان کے مضبوط کردار کی عکاس ہیں جن میں تدبر اور ٹھہراؤ ہے لیکن بعض ایسے لمحات بھی زندگی میں آتے ہیں جب انسان کا تدبر پس پشت چلا جاتا ہے اور عمر کی فصیل ایک دم غائب ہو کر ایک معصوم سی بچی اپنی خواہشوں سمیت سر ابھارتی ہے قرۃ العین حیدر جب اپنے لکھنو کے پرانے مکان اور آئی ٹی سکول کو دیکھتی ہے تو اس کیفیت کا شکار ہوتی ہے۔ سحاب بغور مشاہدہ کرتی ہیں۔

> ''ایک دم عینی چیخی، ایک چھوٹی سی لڑکی، بالکل بچوں کی طرح۔ 'دیکھو سحاب! وہ ادھر، پانچویں روشنی کے پاس وہ بنگلہ اب بھی ہے۔ ابا جان، اماں جان ہم سب یہاں رہا کرتے تھے۔ پانچویں روشنی کے بعد اس طرف پل کی اونچائی پر غور سے دیکھو۔''[۸۶]

قرۃ العین حیدر کے خاکے کا اختتام نہایت پر جوش انداز میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کیا گیا ہے۔ اختتامی الفاظ میں ایک فارسی شعر رقم کرتی ہیں۔ سحاب خود بھی شاعرہ ہیں اس لیے بر محل شعر کا استعمال تحریر میں تازگی پیدا کر دیتا ہے۔ اور دو مصرعوں میں گہری حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

بہ محفل شمع تاباں در گلستاں روبو باشی

الٰہی ہر کجا باشی بہارِ آبرو باشی [۸۷]

ڈاکٹر پرویز پروازی اس خاکے کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''قرۃ العین حیدر کے خاکہ میں ذاتی وابستگی کا تصور ملتا ہے۔'' [۸۸]

سحاب کا تخیل نہایت خوب ہے وہ تصور کو حقیقت کے ساتھ قدم بہ قدم ساتھ لے کر چلتی ہیں۔ سحاب کی ساحر سے پہلی ملاقات بمبئی میں موجود چیمس فورٹ کلب میں منعقد شاعرے میں ہوئی تھی۔ ساحر انہیں سادہ اور اداس شاعر لگا۔ ساحر کی شخصیت کی خامی اس کی شراب نوشی کی عادت تھی۔ چیمس فورٹ کلب میں آنے والے شعرا کے حوالے سے لکھتی ہیں۔

''اس کلب میں شاعروں کی مخصوص نشست تھی اور آدھے سے زیادہ شاعر مفت کے پیمانوں کے لیے آتے تھے اور ساحر بھی اس جمگھٹے میں مل گیا تھا۔ وہ بھی سدا کا پیاسا تھا اور اسی پیاس نے آخر اُسے اتنی جلدی اُٹھالیا.....۔'' [۸۹]

ساحر اپنی شاعری اور وجاہت کے لحاظ سے مرد و خواتین میں یکساں مقبولیت کے حامل تھے اس کے چاہنے والوں کی ایک طویل فہرست تھی لیکن ان سب میں امرتا کی محبت کا آغاز عمر کے سولھویں برس میں ہوا۔ امرتا اور ساحر کے درمیان سب سے بڑی دیوار مذہب کی تھی، امرتا سکھ مذہب سے تعلق رکھتی تھی۔ امرتا کی محبت دیوانگی کی حدوں کو چھونے والی تھی یہاں تک کہ وہ سگریٹ کی عادی ہو گئیں۔

''ساحر کی انگلیوں کو چھونے کی تمنا عمر کے ساتھ بڑھتی رہی، الماری سے اس کے پیے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے اکثر تنہائی میں منہ میں رکھ لیتی جیسے ساحر مجھے مل گیا۔ اور اس طرح میں نے ایک سکھنی نے سگریٹ چپکے چپکے پینا شروع کر دیا۔'' [۹۰]

ساحر لدھیانوی پر لکھا گیا خاکہ تعارفی انداز پر مبنی ہے۔ سحاب نے ان کی زندگی کو مکمل پیش نہیں کیا۔ بلکہ ان کی محبت کی یک رخی تصویر پیش کی ہے۔ اس لحاظ سے اس خاکے میں ساحر کی شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں کا ادارک نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کی زندگی کے ایک مخصوص دور کو بیان کیا گیا ہے۔ خاکہ نگار شخصیت کا مکمل نمائندہ ہوتا ہے وہ جس انداز سے شخصیت کی عکاسی کرے گا قاری کے ذہن پر اسی طرح کا تاثر قائم ہوگا۔ اچھے خاکہ نگار کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ شخصیت کی کلی عکاسی کرے۔

ڈاکٹر پرویز پروازی کے مطابق سحاب نے اس خاکے میں ساحر کی زندگی کی یک رخی تصویر پیش کی ہے، لکھتے ہیں:

> ''ساحر کے خاکے میں جو جذباتی عنصر ہے اسکو سحاب نے بچپن سے ادھیڑ عمر تک کی جذباتی وابستگی کا آئینہ دار بنادیا ہے۔''[۹۱]

رضیہ سجاد ظہیر جہاں ایک طرف خدا کے وجود کی انکاری اور معاشرتی روایات کی مخالف تھیں دوسری طرف مشرقی روایات کی امین بھی تھیں اور انہیں اپنی زندگی کا لازمی جزو سمجھتی تھیں۔ وہ چوڑیاں اور مہندی اپنے لیے لازمی سمجھتیں ان کے نزدیک یہ سہاگن ہونے کی نشانیاں تھیں۔

سحاب نے خاکہ میں جامع انداز سے نظر حیدر آبادی کی گھریلو زندگی کا نقشہ پیش کیا ہے۔ جہاں اپنی بیوی کے پاس آج اشعار کا خزانہ تو چھوڑ گئے ہیں لیکن اس سے انہیں دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں آتی۔ اس حوالے سے ان کی بیوی کے الفاظ میں لکھتی ہیں۔

> ''اے کاش میرے شاعر میاں کو اتنی عقل ہوتی کہ وہ شراب جو مشاعروں میں مفت ملتی تھی اس کے بجائے ایک چھوٹی موٹی سی زمین کا الاٹ منٹ ہی مل جاتا۔ دن رات کی ان ادب نواز محفلوں کی بجائے کاش وہ کسی صاحب اقتدار کے لیے قصیدے لکھ دیتے تو آج شاید کچھ روز کی روٹیاں چل جاتیں۔''[۹۲]

نظر حیدر آبادی شراب کے رسیا تھے اپنی کسمپرسی کے حالات میں گھر میں دو وقت کی روٹی بھی میسر نہ تھی البتہ مشاعروں میں وہ اپنی اس خواہش کو پورا کر لیا کرتے تھے اور یہاں تک کہ مشاعرے میں اپنا کلام پیش کرتے ہوئے خود پر قابو بھی نہیں رکھ پاتے تھے۔ اس حوالے سے لکھتی ہیں۔

> ''تمہارا ضبط تمہاری آواز کا گلا گھونٹ دیتا۔ تمہارا ضمیر اس شراب اور کھانے کی قیمت حقیقتاً ادا کرنا چاہتا مگر تمہاری آواز نہ جانے اس وقت اتنی لرزتی ہوئی، پیچھے جگمگاتے ہال کی روشنیوں کے ساتھ ساتھ ان حسین یادوں میں ڈوبی سرگوشیاں کرتی۔''[۹۳]

خاکے کی بہترین خوبی ہوتی ہے کہ شخصیت کو اس طور سے پیش سے کیا جائے کہ چلتی پھرتی تصویر آنکھوں کے سامنے نظر آئے۔ خاکہ نگار کا شخصیت سے مکمل روشناس ہونا ضروری ہے اس کے حالات زندگی اور سوچ وافکار کا بخوبی علم ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ خاکہ نگار کو بھی شخصیت کے بارے بیان کرتے ہوئے متوازن عکاسی کرنی چاہیے۔[۹۴]

اس خاکے میں سحاب قاری کو اس محفل میں لا کھڑا کرتی ہے اور پھر اپنی آنکھوں سے نظر حیدر آبادی کی بے بسی اور محرومی کو دیکھنے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ وہ الفاظ کی بازیگری سے تمام مناظر کو پیش کرتی ہیں اور قاری مشاعرے سے گھر تک کے واقعات کو تخیل کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔

سحاب کی تحریر میں نظر حیدر آبادی کی احساس محرومی اور تشنگی کا مکمل احساس موجود ہے جیسے وہ سب واقعات کو ایک ایک کر کے دیکھ چکی ہوں اور نظر حیدر آبادی کے گھر سے مکمل واقفیت حاصل ہو۔ سحاب ایک درد مند خاتون تھیں جنہوں نے دوسروں کے کرب کو محسوس کیا اور اس کا مداوا کرنے کی ہر ممکن سعی کی۔ سحاب کی تحریر میں درد مندی اور کاٹ دونوں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اپنے الفاظ کی کاٹ سے ان لوگوں کو جھنجھوڑنا چاہتی ہین جو ادبی محفلوں کی شمعیں روشن کرتے ہیں لیکن کسی شاعر کے گھر کو روشنیوں سے منور نہیں کرتے۔

مسلم اور ہندو مذہب میں سے للتا احمد نے اسلام کو بہترین پایا کیونکہ اسلام خواتین کے حقوق کو مساوی اہمیت دیتا ہے اس حوالے سے خیالات کا اظہار یوں کیا۔

> ''اسلام میں عورت کے لیے کتنی آسانیاں ہیں ہمارے ہاں تو جہیز کی مصیبت تھی جس کی وجہ سے ہندو مذہب میں آدھی سے زیادہ لڑکیاں اطمینان کی ازدواجی زندگی نہیں گزار سکتیں طلاق یافتہ اور بیوہ کی زندگی بھی اتنی کھٹن نہیں گزرتی جتنی ہندو مذہب میں کم جہیز والی عورت کی گزرتی ہے۔''[۹۵]

سحاب نے للتا سے ہونے والی پہلی ملاقات میں بننے والے تاثرات کو یوں بیان کیا ہے۔

> ''اور میں نے للتا کو وہ پورا واقعہ بھی سنا دیا جو مجھ میں چھپی ایک خراب خاتون نے چپکے سے کہا تھا۔ دیکھا ہے نا ہندو۔۔ خود تو اپنے گھر میں دیوار پر نٹ راج کی تصویر کیسے لگا رکھی ہے۔''[۹۶]

سحاب خاکے کا تاثر اجاگر کرتے ہوئے اپنی شخصیت کو خاکے پر حاوی نہیں آنے دیتیں بلکہ اپنے دل میں سر ابھارتے منفی تاثرات سے شخصیت کا جو پہلا تاثر قائم کرتی ہیں اس کا برملا اظہار کر دیتی ہیں۔

سحاب نے للتا احمد کی حلیہ نگاری یوں بیان کی ہے۔

''اودے رنگ کی ساڑی خوبصورت سے جسم پر لپیٹے سیاہ چمک دار بالوں کا جوڑا بنائے گلے میں سوتر منگل سہاگنوں کی نشانی پہنے جس سانولی سلونی خاتون نے میرے پاس اپنی گاڑی روکی۔۔۔۔۔۔ یہ للتا تھی۔''[97]

ناہید صدیقی کی شخصیت کے حوالے سے لکھتی ہیں۔

''ہاتھوں کی انگلیوں کی پوروں سے وہ جملوں کے بڑے ترچھے پر مفہوم موڑوں کو روکے رکھتی ہے پھر ہنسی کو قہقہوں کے بیچ میں سے روک لیتی ہے ابرو کے ایک اشارے سے، پلکوں میں لپیٹ کر آنکھوں میں پی جاتی ہے اس کے انگ انگ میں روم روم میں لذت چھپی ہے۔''[98]

ہندوستان کی نامور اداکارہ اوما کیسٹپ کے چہرے کے تاثرات کو دلنشیں انداز میں یوں لکھتی ہیں۔

''تم پیتل کی تھالی میں اپنی آنکھوں کے دیئے جلائے، چہرے پر کھلے پھولوں کا پرشاد لیے، دیوتا کی آرتی اتارتی رہیں۔''[99]

خاکہ نگاری کے لیے شخصیت کے ظاہر و باطن سے واقفیت ہونے کے ساتھ اس کے مزاج، عادات واطوار اور کردار نگاری سے شخصیت کے بارے مکمل واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ سحاب ناہید صدیقی کی سراپا نگاری یوں بیان کرتی ہیں:

''لمبے نہ سلجھنے والے بالوں میں ناہید نے تیسری دفعہ گرہ لگا کر جوڑا بنایا۔ پتلی صراحی دار گردن بالوں کے بوجھ کے بعد ویسی ہی مغرور سی ستواں کھڑی رہی۔ نازک موہنی سیمابی طبیعت کی لڑکی، پاکستان کی مشہور و معروف کتھک ڈانسر جس کے ہاتھ ابرو، پورا جسم بات بات پر نرت کرتا ہے۔''[100]

ناہید صدیقی نے پی آئی اے کے گروپ کے ساتھ مختلف ممالک میں پرفارم کر کے اپنے ملک کا نام روشن کیا۔ انہیں حکومت پاکستان کی طرف سے پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا اور وہ پذیرائی حاصل نہ ہوئی جو ان کی خواہش تھی۔ سحاب نے اس خاکے میں ناہید صدیقی کی محنت و کاوشوں اور ساتھ ہی ان کی زندگی کے اصل دکھ کو بھی بیان کیا ہے۔ سحاب نے دور حاضر کی بدلتی قدروں پر چوٹ کی ہے جہاں انسان نے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے تجارت کو شعار بنالیا ہے اور دلوں کے معاملے کو بھی تجارت کا ذریعہ بنادیا ہے۔ سحاب نے لفظ تجارت استعمال کر کے حقیقی خوشیوں کو ترازو میں تولنے اور ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے سے مماثل قرار دیا ہے۔ انہوں نے مرد کو سمندر کے کنارے بکھری ہوئی لہروں سے مماثل قرار دیا ہے اور استفہامیہ انداز اپنایا ہے جس میں دردمندی اور دکھ کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ سحاب دور حاضر کے بدلتے رجحانات میں اخلاقی تنزلی کا نقشہ اس انداز میں بیان کرتی ہیں۔

''آج کل کی لڑکیاں کس قدر تیزی سے کراچی کے سمندر کے کنارے ان بپھری ہوئی لہروں کے ساتھ کیسے اپنے آپ کو بہادیتی ہیں! وہ قہقہے لگاتی ہوئی خوش رہتی ہیں کیا یہ زمانہ بدل گیا یا دلوں کے مقابلے اب بڑے بڑے گھروں، محلوں، اور بڑی گاڑیوں کے لین دین میں سراسر تجارتی ہو گئے ہیں؟''[۱۰۱]

ریشماں نے اپنی زندگی کی حقیقت کو واضح سب کے سامنے پیش کیا انہوں نے سادگی کو اپنایا شعار بنایا اور اپنی آواز کے جادو سے دلوں کو تسخیر کیا۔ اس کی آواز میں کوئل کی کوک کی سی صدا ہے جیسے اس کے اندر کوئی بے چین روح سمائی ہو جس میں خدا سے محبت کا جذبہ بھی ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ ان کے عارفانہ کلام میں عشق الٰہی کا جذبہ حد سے زیادہ موجود ہے۔ ان کی آواز میں تڑپ ہے۔ سحاب ریشماں کی لگن اور تڑپ کو حضرت بی بی حاجرہؓ کی تڑپ سے مماثلت دیتی ہیں۔ اس حوالے سے لکھتی ہیں۔

''ہائے او ربا دل نئیں لگ دا'' جب گاتی ہے تو کیا یہ صدا مدینے سے ہوتی ہوئی آسمانوں تک نہیں جاتی ہو گی۔ یہ تڑپ یہ لگن تو اللہ کو بھی پسند ہے ورنہ ایک ماں کی بے چینی پر جو بچے کی پیاس میں تڑپ رہی تھی، ریت کی چھاتی سے دودھ کی بوندیں مانگ رہی تھی اور اس بے چینی کو اللہ نے آب زم زم سے سیراب کر دیا۔''[۱۰۲]

سحاب آواز میں تڑپ اور کوک کو حضرت بی بی حاجرہؓ کی تڑپ سے ملاتی ہیں۔ جب حضرت حاجرہؓ اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کی پیاس کی کیفیت کو محسوس کر کے صفا و مروہ کی پہاڑیوں پر زندگی کے آثار تلاش کر رہی تھیں تو اللہ رب العزت نے ان کی تڑپ اور کاوش کو پسند فرمایا اور آب زم زم حضرت اسمٰعیلؑ کے پاؤں کی رگڑ سے زمین سے رواں ہونے لگا۔ اسی تڑپ اور مضطربانہ دعا کی بدولت آج تک اس مقام سے زم زم رواں ہے اور حضرت بی بی حاجرہؓ کی اس سعی کی یاد میں مناسک حج کے ضروری احکام میں صفا و مروہ کے سات چکر لگانا بھی شامل ہیں۔ اسی تڑپ اور لگن کی مثال حضرت بلالؓ کی بھی ہے جن کی زبان کی لکنت کو نہیں بلکہ یاد الٰہی کے جذبے کی صداقت کو اللہ تعالیٰ نے سب سے مقدم رکھا اور حضرت بلالؓ کی آواز میں اللہ کی کشش کا احساس لیے مسلمان جوق در جوق رب العزت کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہونے کے لیے دوڑے چلے آتے، حضرت بلالؓ کی آواز میں اللہ تعالیٰ نے جادو دیا تھا سحاب ان کی آواز کو سروں میں ڈوبی ہوئی آواز کہتی ہیں جس میں ترنم ہے لکھتی ہیں۔:

''ایک کالے غلام کو اگر خوبصورت آواز کا عطیہ اللہ میاں نہ بخشتا، ہمارے رسول کبھی اس سریلی آواز کا پیغام نہ سناتے۔ آؤ گھروں کو چھوڑ دو دنیا کی محبت چند منٹوں کے لیے چھوڑ دو، ایک جگہ جمع ہو جاؤ اور

اس کے آگے سر جھکادو، جو صرف تمہارا رب ہے جو صرف ایک ہے جو عظیم ہے، وہی آواز جو مقناطیسی سرگم لیے پہنچتی رہی سارے سروں سے رچی ہوئی۔ سر کے بغیر کوئی چیز روح سے نہیں نکلتی۔"[۱۰۳]

سحاب سُر کو روح کی بنیاد قرار دیتی ہیں ریشماں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سحاب نے بیان کیا ہے۔ ریشماں جہاں اچھی گلوکارہ تھی وہیں مامتا کے جذبے سے معمور دل بھی رکھتی تھی اور پروگرام کے دوران بھی اپنے بچوں سے غافل نہ رہتی۔ خاکہ نگار کا کام محاسن کے ساتھ ساتھ خوش کن کمزوریوں کا تذکرہ کرنا بھی ضروری سمجھا ہے۔ ریشماں نے رسمی تعلیم حاصل نہیں کی۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان میں اتنی صلاحیت دی کہ وہ گانے کے سر تال کو سمجھنے کے قابل ہوئیں اور بیرون ملک میں اپنی آواز کا جادو جگایا۔ ریشماں نے اپنی آواز کے جادو سے دشمنوں کے دلوں کو بھی مسخر کر لیا اور وہ لوگ جو کل تک جان کے دشمن تھے آج ان کی آواز کے مداح بن گئے۔ سحاب ریشماں کی مقبولیت کے حوالے سے لندن میں منعقد پروگرام کا ذکر اس طرح کرتی ہیں۔

"ہال شام ہی سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا پگڑیاں ہی پگڑیاں نظر آرہی تھیں پورے جوش سے لوگ نعرے لگا رہے تھے یہ وہی سب سردار تھے۔ جن سے فسادات میں میری جان نکلتی تھی۔ کاش فسادات کے زمانے میں ہمارے ہاں بھی کوئی ریگن ہوتا تو اس قتل وغارت کے میدان میں ریشماں ہر ٹرین چلنے سے پہلے گاتی ہوئی آجاتی۔۔۔۔ تو ساری کرمانیں میانوں میں چلی جاتیں۔"[۱۰۴]

سحاب بے لوث محبت کرنے والی شخصیت تھیں۔ جنہوں نے اپنے وطن اور وطن کے ستاروں کو ہر لحہ فوقیت دی اور وطن کی سربلندی کے لے ہر وقت خود کو مشغول رکھا انہوں نے وطن کی گلوکاروں کو پھولوں سے تشبیہ دی ہے اور ان پھولوں کو محفوظ کرنے کی استدعا کی ہے۔

ایرا موئترا سحاب کی بچپن کی ساتھیوں میں سے تھیں۔ جو دہلی میں سحاب کے گھر کے سامنے والے گھر میں رہتی تھیں اس بنگالی لڑکی کا سراپا اس طرح بیان کرتی ہیں کہ تصویر بنا دیتی ہیں۔

"تمھاری کیسری ساڑی جو پتلی کمر میں لپٹی ہوئی تھی جوڑے میں بندھے ہوے گیندے کے پھول، بندی کی خوبصورتی، وہ تمھارے کمان سے ابرو جیسے ان میں کبھی شکنیں نہ پڑیں گی، گھنی پلکیں، مسکراتے ہونٹ۔"[۱۰۵]

سحاب جزئیات نگاری سے کام لیتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بھی نہایت اہتمام سے بیان کرتی ہیں چاہے وہ گھر کا نقشہ ہو یا کسی شخصیت کے خدوخال یا انداز واطوار، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک ایک چیز نک سک سے تیار سحاب کی تیز نگاہ کے تعاقب سے نہ بچ پائی ہو۔ ایرا موئترا کے گھر کا نقشہ یوں بیان کرتی ہیں۔

''اس کمرے میں تین بڑی تصویریں تھیں۔ سب سے بڑی سبھاش چندر بوس، پھر گاندھی جی اور جواہر لعل نہرو ان سب کے بعد کالی ماں کی تصویر تھی جہاں وہ روز گیندے کے تازہ پھول رکھتی اور کچھ اپنے جوڑے میں اٹکا لیتی۔''[۱۰۶]

ایرا موئترا بنگالی لڑکی تھی اور اپنے رسوم و رواج کو نہایت اہتمام سے اپناتی تھی خاص طور پر اپنی ماں کی غیر موجودگی میں ایک ذمہ دار بیوی کی طرح سے نک سک سے تیار ہو کر خوش ہوتی۔ بنگالی لڑکیاں شادی سے پہلے سر پر دوپٹہ نہیں لیتیں۔ سحاب اس حوالے سے بنگالی خواتین کے بارے میں لکھتی ہیں۔

''بنگال کی عورت بھی کتنی معصوم ہوتی ہے کتنی جلدی خوش ہو جاتی ہے، ان کا سہاگ، چابیوں کے گچھے کا وزن، سرخ رنگ، لال کنی کی ساڑی جس سے اپنے خوبصورت بال شادی کے بعد ہمیشہ کے لیے چھپا لیتی ہے۔''[۱۰۷]

بنگالی خواتین ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے کے لے ساڑی کے پلو میں چابیوں کا گچھا باندھتی ہیں۔ بنگالیوں کے شادی بیاہ کے لیے رسم ورواج بھی بہت مختلف ہوتے ہیں۔ لڑکی والے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے پیسے جوڑ جوڑ کر رکھتے ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنی بیٹی کے ساتھ بہت ساری رقم بھی لڑکے والوں کو دینی ہوتی ہے۔ سحاب منظر نگاری سے ایک منظر کو نہایت اہتمام کے ساتھ ترتیب وار پیش کرتی ہیں۔ بنگال کی تہذیب اور رسم ورواج کو بھی سادہ اور آسان اسلوب میں بیان کر دیا ہے۔ سحاب حقیقت حال بیان کرنے میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنے قلم کو حرکت دیتی ہیں اور حقیقت کو واشگاف انداز میں بیان کر دیتی ہیں۔ روشن لال ناگرت ہر ساز کا ماہر مانا جاتا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کرتا تھا۔ ایک دن ایرا موئترا کے گھر پر اچانک روشن لال ناگرت کو دیکھ کر سحاب حیران ہوئے ۔ روشن اور ایرا موئترا نے مذہبی پابندیوں اور معاشرتی قوانین کو بالائے طاق رکھ کر بھاگ کر شادی کی تو سحاب کو اپنی دوست کی خود غرضی پر افسوس ہوا۔ ایرا کے نام کا مطلب قربانی دینا ہے۔ ایرا کے اس عمل پر سحاب ان الفاظ میں تاسف کا اظہار کرتی ہیں۔

''عورت اتنی سنگ دل بھی ہو سکتی ہے۔ اپنی ہی جیسی ایک عورت پر خود ظلم کیا وہ محبت تھی۔ ایرا تم تو بڑی نرم دل تھیں شاید محبت ایسی ہی ہوتی ہو۔''[۱۰۸]

سحاب کا بچپن اور لڑکپن دلی میں گزرا جہاں ان کا میل جول دیگر مذاہب کے لوگوں سے بھی ہوتا۔ سحاب کی بیشتر سہیلیاں ہندو مذہب سے تھیں اور ایرا موئترا بنگالی۔ سحاب نے بہترین انداز میں ان کے طرز معاشرت کی عکاسی کی ہے۔ اسلوب میں الفاظ بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک مخصوص ذخیرہ الفاظ کا استعمال مصنف کی پہچان کا ذریعہ بنتے ہیں۔ انھی کے سبب اُس کا انداز بیان منفرد قرار دیا جاتا ہے۔ اس انفرادیت میں اُس کی سوچ اور افکار کے علاوہ معاصر ادبی رجحانات بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ مصنف اپنے خیالات کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرتا ہے۔ افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں الفاظ کے انتخاب اور سوچ کا زاویہ مختلف ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے الفاظ کا محتاط انداز میں استعمال ہر صنف ادب کے لیے ضروری ہے۔ سفر نامے میں سفر نامہ نگار مشاہدات و تجربات کو بیان کرتے ہوئے تجسس کی فضا تشکیل دیتی ہے اور ہر منظر کو بیان کرتے ہوئے جزئیات نگاری سے کام لے کر ان دیکھی فضاؤں کے بارے مفصل معلومات مہیا کر کے قاری کو اپنا ہمنوا بناتی ہے۔ اس میں سب سے اہم بات زمانی اقدار کا خیال بھی ہے۔ سفر نامہ نگار زمانۂ حال کے واقعات کو پیش کرتی ہے۔ سحاب کے سفر نامے میں سیاحت کے حوالے سے پیرس کا ذکر اس معیار پر پورا اترتا ہے جہاں سحاب نے اپنی شخصیت کو سفر پر حاوی نہیں ہونے دیا اور ماضی کی بازگشت سے جان چھڑا کر حال میں خوش اور مطمئن نظر آئی ہیں۔ ایران اور نائیجیریا کے سفر نامے میں متعدد بار وہ اپنی خانگی زندگی کی تلخ یادوں میں کھو جاتی ہیں جس سے سفر نامے کا تاثر مجروح ہوتا ہے۔ کتاب کا دیباچہ مصنفہ نے خود لکھا ہے اس سفر نامے کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''میں نے دنیا دیکھی ہے دور سے۔ اپنے گھر اپنی زندگی کو لپٹے ہوئے علیحدہ نہیں ہوئی۔ اپنے دکھوں سے اس لیے بہت کم دنیا کا حسن دیکھا اس میں نہ صبح بنارس ہے نہ کھٹمنڈو کی شام۔''[۱۰۹]

سیاح ہمیشہ گرد و پیش کا باریک بینی سے جائزہ لیتا ہے۔ کوئی بھی منفرد پہلو اس کی نظر سے کم بچ پاتا ہے سفر نامہ نگار میں تحیر اسے نئی فضاؤں کے بارے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے پر اکساتا ہے۔[۱۱۰]

سحاب مصر کی تہذیب و تمدن کا پاکستانی تہذیب و تمدن سے موازنہ کرتی ہیں۔ مصر کی خواتین کی خوبصورتی دیکھ کر سحاب کو پاکستانیوں کی رنگت مرجھائی اور پھیکی سی لگی۔ مصر کی تہذیب جاننے پر انہیں حیرت انگیز واقعات جاننے کو بھی ملے۔ پاکستانی معاشرے میں کھانا اور بالخصوص روٹی کو دستر خوان میں لپیٹنے کا عام رواج ہے ہوٹلوں میں بھی کھانا پیش کرنے کا خاص اہتمام ہوتا ہے جبکہ مصر میں انہیں سب سے حیران کن چیز روٹی کو چھتری پر لیے بیچنا لگا۔

سحاب نامانوس الفاظ کا استعمال نہیں کرتیں بلکہ روزمرہ اور مانوس الفاظ استعمال کرکے واقعات کو سادہ انداز میں پیش کرتی ہیں۔ان کی ذہنی رو ایک واقعے کو دوسرے سے جوڑ کر ماضی اور حال کے درمیان ربط قائم کر دیتی ہیں وہ تاریخ کا سرسری ذکر کر کے حال پر تبصرہ کرتی چلی جاتی ہیں اور خود کو ماضی میں گم نہیں کر لیتیں۔

سحاب کرداروں کی زبان سے الفاظ کہلوانے کا ہنر جانتی ہیں۔ سفر کے دوران ہندوستان سے آئے ہوئے پانچ طالبعلم جو ہندوستان سے عربی کی تعلیم حاصل کر کے مصر جارہے تھے اپنی مقامی زبان بہاری میں مصر کی زبان کے بارے اپنے تاثرات یوں بیان کرتے ہیں۔

> ''یہی فرمادت ہیں آپ صاحب یعنی ناگرامر ان کی سیدھی۔ گردانوں میں بھی نہیں آوت ہیں بھیا! کیا عربی مختلف بھی ہوتی ہے۔''[111]

انگریزی ادب کے مشہور رومانوی شاعر کیٹس اور اس کی محبوبہ فینی براؤن کے زیر استعمال رہنے والی اشیا، تحائف، شاعری اور خطوط وغیرہ کے بارے مکمل آگاہی دیتی ہیں۔ کیٹس ہاؤس میں رکھی تمام اشیاء کی ترتیب بیان کرتے ہوئے جزئیات نگاری سے کام لیتی ہیں کہ اس گھر کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے بن جاتی ہے۔وہاں موجود اشیاء میں ٹوٹا ہوا قلم، انگوٹھی کی رنگت، تارکشی کے دھاگوں کی رنگت، انگشتانہ اور قینچیاں اپنی عمر پوری کر چکی تھیں۔ان کی ماند پڑتی رنگت کے بارے بھی مصنفہ نے وضاحت سے بیان کیا ہے ۔

ایران اسلامی ملک ہونے کے باوجود مغربی و مشرقی تہذیب کی عکاسی لیے حیران کن انکشافات کا باعث بھی تھا۔ سحاب واقعات کو بیان کرتے ہوئے تصویر کشی کرتی ہیں حمام میں نہاتے ہوئے انہوں نے حمام میں داخل ہونے سے لے کر نہانے تک کے تمام واقعات کی منظر کشی کی جس سے قاری کے ذہن میں ایرانی طرز معاشرت سے جانکاری ہوتی ہے۔ایران میں اس زمانے میں گھروں کے اندر غسل خانے کا انتظام نہیں تھا بلکہ محلے کے حمام میں خواتین جا کر نہاتیں جہاں ان کی مدد کے لیے کلفتیں موجود ہوتیں۔ حمام کے گرم پانی میں جیسے تیل ملا ہوا ہو جس میں نہا کر جسم کا سارا میل اتر جاتا تھا۔ سحاب کو حمام میں نہانے کا دعوت نامہ دیا گیا۔انہیں خواتین کا حمام میں نہانا اچنبھے کی بات لگی تاہم اسٹیشن ڈائریکٹر کی بیوی کے مدعو کرنے پر پہلی اور آخری بار انہیں جانا پڑا۔

سفر نامہ نگار جہاں بھی جاتا ہے اپنے وطن سے محبت کا جذبہ اس کے اندر ہمہ وقت موجزن رہتا ہے۔اپنے وطن کی مٹی، ثقافت، طرز بود و باش، غرض ہر لحاظ سے تقابلی مطالعہ کی فضا اس کے ذہن میں بنی رہتی ہے سحاب بھی ایران کی فضا اور طرز تمدن کے اختلاف کا برملا اظہار کرتی ہیں۔ ایران کے شہر زاہدان کو دیکھ کر انہیں یوں محسوس ہوا جیسے سندھ کے

شہر ٹنڈو جام سے بھی زیادہ پسماندگی کا شکار ہو، ریتلا علاقہ جہاں دن میں سخت گرمی اور راتیں ٹھنڈی ہوتیں وہاں کے لوگ بھیڑ بکریاں چرا کر گزر بسر کرتے تھے۔

سحاب فطری مناظر سے بہت لطف اندوز ہوتیں خاص طور پر آسمان پر چھائے گہرے بادل اور بارش کے موسم کا ذکر افسانوں اور سفر نامے میں متعدد بار کیا۔ وہ قدرتی مناظر اور رنگ و بو کی دلدادہ ہیں اور انہیں مستعار لے کر دلی کیفیات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

نائیجیریا میں معاشی بدحالی اس حد تک پہنچی ہوئی کہ مرد و خواتین اور بچے تک ذریعہ معاش تلاش کرنے میں سرگرداں نظر آئے۔ والدین غربت و افلاس سے تنگ آ کر اپنے بچوں کو دس یا بارہ پاؤنڈ میں بیچ دیتے جہاں انہیں اپنے مالکوں کی طرح طرح کی اذیتیں سہنی پڑتیں۔ نائیجیریا کی عورتیں گھروں میں جا کر لسی، مکھن، کھوپرے کے ٹکڑے، امرود اور باجرے کے آٹے کے لڈو بیچ کر اپنا پیٹ پالتی تھیں۔ وہاں کی خواتین کافی محنت کش اور زندگی کا بوجھ تنہا اٹھانے کی عادی ہوتیں۔ وہ محنت سے شاکی نہ ہوتیں اور بڑے جوکھوں کے کام بھی تن تنہا کر لیتیں جنہیں دیکھ کر ان کی ہمت کی داد دینی پڑتی۔ ان کاموں کی نوعیت کے حوالے سے لکھتی ہیں۔

> ''درختوں کے تنے کاٹ کر اس کو اندر سے کھوکھلے کر کے کشتی بنا لیتی اس میں جھاڑیاں درخت کی ٹہنیاں، لسی کے مٹکے رکھے نیلے شفاف سے دریا میں سادے سے لکڑی کے ٹکڑوں کو چپو بنائے ڈوبتے سورج کی طرف نکل جاتیں۔''[۱۱۲]

نائیجیرین لوگوں کے چہروں کے تاثرات خوشی و غم کے امتزاج کی کیفیت سے نابلد نظر آتے۔ ایک سال نائیجیریا میں رہتے ہوئے کبھی انہیں دل سے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ البتہ تھوڑا سا مسکراتیں جو سحاب کو بے وقوفوں والی ہنسی لگی۔ زندگی پر صابر و شاکر۔ شکوہ و شکایت کی عادت سے ناواقف تھیں ایک ہی شخص کی چار بیویاں تو وہ بھی چاروں ہی صبر و شکر کا اعلیٰ نمونہ۔ سب زندگی سے مطمئن نظر آئیں۔ سحاب کو نائیجیرین خواتین میں ''فلانی''، نسل کی خواتین قد کاٹھ اور چہرے کی کشش کی بدولت اچھی لگیں ان کی شخصیت سے مرعوب ہو کر سراپا نگاری یوں کرتی ہیں۔

> ''فلانی ذات کی عورتیں کافی حد تک خوبصورت ہوتی ہیں سیاہی کے رنگ اس میں چمک لمبی لمبی گردنیں آبنوسی پتھر کی سختی لیے جسم ایسی دلنوازی اور قدموں کی لمبائی جو ناپی ہی نہیں جاتی۔ ان کا غرور بھرا قدم اٹھانا جیسے ساری دنیا کو اپنے پیروں تلے دباتی چل رہی ہو۔''[۱۱۳]

نائیجیرین لوگوں کا طرز تمدن ایک خاص کلچر کی عکاسی لیے نہ تھا۔ نائیجیریا کا قصبہ 'کانٹا گورا' کا قبیلہ پگان (Pagan) خالص افریقین طرز تمدن کا عکاس تھا۔ جہاں مرد و خواتین برائے نام لباس پہنتے۔ عورتیں درختوں کے پتے باندھتیں جبکہ مرد پروں سے اپنے جسم کو ڈھانپتے تھے۔ غیر ملکیوں اور فوٹو گرافرز کو اس علاقے میں جانے کی اجازت نہ تھی۔

سحاب نائیجیریا میں عورت کی کم مائیگی اور استحصال دیکھ دیکھ کر افسوس کا اظہار کرتی ہیں۔ نائیجیریا کی خواتین کے بارے لوگوں کے اس طرح کے تاثرات انہیں سننے کو ملے جو عورت کی کھلی تذلیل ہے۔

''نائیجیریا میں کھانا بہت سستا اور لڑکیاں ایک بسکٹ کے پیکٹ میں خرید لو۔''[۱۱۴]

سفر نامہ نگار کے اسلوب کا والہانہ انداز تحریر میں معنویت پیدا کر کے قاری کے لیے مسرت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ سفر نامے میں تشبیہ کا عنصر قاری کو انوکھی طرز سے دیکھنے اور سوچنے کا وسیلہ مہیا کرتے ہیں یوں قاری تخیل کی آنکھ سے مشابہت کے ذریعے ان دیکھی فضاؤں کو محسوس کر کے سفر نامہ نگار کے ہمقدم انہی منزلوں کی مسافت طے کرتا ہے۔[۱۱۵] سحاب آسمانی بجلی کی کڑک اور چمک کو یوں بیان کرتی ہیں:

''ایسی برق کی دل دہلانے والی آواز پھر چاندی جیسی چمک جس میں حضرت موسیٰ کی آنکھیں بھی خیرہ ہو گئی تھیں۔''[۱۱۶]

نائیجیریا میں قیام کے دوران ان کی ملاقات حوا سے ہوئی۔ حوا سحاب کی غیر موجودگی میں سحاب کے شوہر گل کے ساتھ رہتی تھی۔ سحاب کو پہچان کر ہوٹل میں اس سے ملنے چلی آئی۔ حوا سانولے رنگ کی مالک تھی۔ اپنے چہرے کو خوبصورت اور پرکشش بنانے کے لیے اس نے ہونٹوں کے دونوں سروں پر جہاں خم پڑتا وہیں چھوٹی چھوٹی پنکھیاں گودی ہوئی تھیں مسکرانے سے پنکھیاں کھل کر مسکراہٹ میں دلکشی پیدا کر دیتیں۔ ساتھ ہی کانوں کے پاس نیلے نقش و نگار زیور کی طرح کے بنے ہوئے، سر پر سنہری رنگ کا سکارف لپیٹے فلانی نسل کی خواتین کی طرح نظر آتی۔

سحاب جنس نگاری سے بھی کام لیتی ہیں۔ اپنے شوہر کے تعلق کو ظاہر کر کے آزاد معاشرے میں بننے والی برائیوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ سحاب جنس نگاری کرتے ہوئے مکمل تفصیل میں نہیں جاتی بلکہ مبہم انداز میں نائیجیریا کے طرز رہن کی طرف اشارہ کر دیتی ہیں۔ اس سفاک حقیقت کو جان کر وہ جس ذہنی کرب سے گزریں مصنفہ نے اسکی عکاسی بھی کی

ہے۔ سحاب عورت کے دل میں ہونے والے محبت، نفرت، حسد اور رقابت جیسے جذبات رکھنے والی جیتی جاگتی کردار ہیں۔ انہیں نائیجیریا کے لوگ احساس سے عاری محسوس ہوئے:

پلاس ڈی لا کونکورڈ میں لگے سیاسی شخصیات کے مجسموں کے بارے لکھتی ہیں:

"جگہ جگہ مجسمے لگے ہوئے تھے فواروں کی پھوار میں جل پریاں ننھے فرشتوں کے جسم پتھروں میں بدل گئے تھے اور وہ پانی میں نہاتے جا رہے تھے۔ تالابوں کے چاروں طرف فرانس کے مختلف شہروں کا روایتی لباس پہنے وہاں کی رہنما و سیاسی خواتین کے مجسمے پتھر کی زبان لیے خاموش کھڑے تھے۔"[۱۷]

سحاب سفر نامے کو تاریخ کے آئینے میں لکھتی ہیں۔ میوزیم میں ۱۷۸۹ء کے انقلاب خواتین کی تصویر دیکھ کر فرانس کی ان باہمت خواتین کا حوالہ رقم کرتی ہیں جنہوں نے مردوں کے شانہ بشانہ آنے کے لیے حق خود ارادیت کا علم بلند کیا۔ مظاہروں کے نتیجے میں خواتین کو شخصی آزادی اور ووٹ ڈالنے کی اجازت دی گئی۔ سحاب جس عمارت کو بھی دیکھتیں وہاں کے بارے مکمل تاریخی پس منظر پیش کرتی ہیں۔ سحاب قاری کا ہاتھ تھام کر ہر منظر اپنی آنکھوں سے دکھانے کا ہنر جانتی ہیں۔ میوزیم میں لگی ایک ایک تصویر اور مجسموں کا بغور مشاہدہ کر کے قاری تک اس کی معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔ باریک بینی سے جاننے کا تجسس انہیں ماضی میں لے جاتا ہے جہاں بادشاہوں کے عہد میں بنائی جانے والی عمارات اور دنیا کے مختلف حصوں سے اکٹھے کیے گئے نوادرات کو اکٹھا کر کے میوزیم کا حصہ بنانے اور اس کی تزئین و آرائش کے لیے کی جانے والی کاوشوں کی تخیلی تصویر آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔ پیرس کے تمام سیاحتی مقامات کی سیر کرتے ہوئے وہ ہر ایک مقام کی تعمیر سے لے کر موجودہ حالات کی معلومات فراہم کرتی ہیں۔ مونالیزا کی تصویر دیکھ کر بھی اس کے پس منظر کو بیان کرتی ہیں۔

مونالیزا لیونارڈو ڈاونچی کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ مونالیزا ایک تصویر نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا حقیقی کردار ہے۔ فرانس کے رئیس فرانسسکو کی اہلیہ مونالیزا اپنی خوبصورتی اور ناقابل تسخیر پورٹریٹ کے حوالے سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس تصویر کو بنانے کے بعد خود لیونارڈو بھی اس تخلیق کے گرویدہ ہو گئے بعد ازاں اس طرح کی تصویر بنانے کی بارہا کوششیں کی گئیں لیکن لیونارڈو کی پورٹریٹ کے مقابل کوئی نہ آ سکی مونالیزا کے چہرے کی متانت، ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم اور آنکھوں کا ہر زاویے سے دیکھنے پر ایک جیسا تصور اس کی دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں۔

پردیس میں ہمیشہ اپنا وطن اور اپنے لوگ بہت یاد آتے ہیں۔ سحاب کو بھی پی آئی اے آفس جا کر وہاں غیر ملکی خواتین دیکھ کر یہ خواہش جاگی کہ ان کی بجائے پاکستانی خواتین فرنچ زبان سیکھ کر یہاں اپنے ملک کی نمائندگی کریں کیونکہ دیار غیر میں اپنی زبان میں بات کرنے کو بہت دل چاہتا ہے ان غیر ملکیوں کو دیکھ کر انہیں اپنے ہم وطنوں کی بہت یاد آتی۔

پیرس کی فلی مارکیٹ دیکھنے کا بھی سحاب کو موقع ملا۔ اسے پیرس کا دروازہ کہا جاتا ہے جہاں نوادرات انتہائی مہنگے داموں ملتے ہیں۔ اس بازار پر فرانس کی مشہور مصنفہ وسیاسی رہنما اور فیمنسٹ سیمون بوئیرے کا مقولہ سر عنوان درج ہے کہ اس بازار میں اشیاء جتنی پرانی ہوں اتنی ہی ان کی قیمت زیادہ ہو گی لیکن عورت کی قیمت بچپن سے جوانی تک بڑھتی ہے اور بڑھاپا اس کی قیمت کم کر دیتا ہے۔ فلی مارکیٹ میں سحاب کو ایک چھوٹی سی گڑیا پسند آئی قیمت جاننے پر خریدنے کا ارادہ ترک کرنا پڑا اس حوالے سے رقم کرتی ہیں:

> ''انگلی کے برابر گڑیا کی جب یہ حقیقت ہو تو وہ لکڑی کا فریم ۱۰۰ پونڈ میں برا نہیں تھا اور ہم نے ننھی منی گڑیا کو چپکے سے مسہری میں لٹا دیا نہ جانے کتنے سالوں سے لالٹین اٹھا لیے انڈوں کی ٹوکری اٹھائے ہسپتال میں بھاگی جا رہی تھی کچھ دیر آرام کر لے۔''[۱۱۸]

سحاب مشرقی تہذیب و تمدن کو مغربی تہذیب و تمدن میں تلاش کرتی رہیں۔ انہیں فرانس کی تہذیب لکھنو کی تہذیب سے ملتی جلتی لگی رکھ رکھاؤ، ادب آداب معذرت اور تشکر کا بے پناہ اظہار ان کا خاصا تھا۔ فلی مارکیٹ میں بٹوؤں کی حفاظت کا بطور خاص پیغام ملا جسے مصنفہ نے حفظ ماتقدم کے طور پر عمل کیا۔ یہاں ٹرکش الجزائر کے لوگ تھے جبکہ وہاں ایسی دکانوں پر بلوچی مکرانی کاروبار کرتے پائے جاتے ہیں۔ سحاب سفر نامے میں واقعات بیان کرتے ہوئے تشبیہ واستعارے کا استعمال بھی کرتی ہیں۔ ان دیکھی فضاؤں اور مقامات کے بارے معلومات بہم پہنچانے کے لیے الفاظ کو مجاز کا سہارا لینا پڑتا ہے اس طرح قاری باآسانی ایک خیالی مجسم تشکیل دے کر تخیلی بنیادوں پر ان مقامات کی سیر کرتا ہوا محسوس کرے۔

ایران کے شہر زاہدان کے بارے تمثیل نگاری سے یوں کام لیتی ہیں:

> ''زاہدان خاموش اداس اجڑا ہوا۔ ایک ببول کا درخت تھا۔''[۱۱۹]

سمندر کی وسعت اور اس میں جہاز کے سفر کے لیے تشبیہاتی انداز یوں اپناتی ہیں:

> ''جہاز میں سمندر چاروں طرف ایسا پھیلا ہوا تھا جیسے پانی ساری دنیا میں ہے اور جہاز ایک کٹورا ہو۔''[۱۲۰]

چھوٹے چھوٹے جزائر کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''پہاڑیاں ہی پہاڑیاں پانی کی گود میں تیر رہی تھیں۔''[۱۲۱]

سحاب محاورات کا استعمال بر محل انداز میں کرتی ہیں:

''ہلدی لگی نہ پھٹکڑی۔''[۱۲۲]

مصنفہ محاورات کا استعمال کرتے ہوئے غلطی بھی کر گئی ہیں انہوں نے لکھا ہے:

''چاروں انگلیاں گھی میں'' جبکہ اصل محاورہ ہے۔ ''پانچوں انگلیاں گھی میں۔''[۱۲۳]

سحاب الفاظ کے انتخاب میں محتاط انداز اپناتی ہیں۔ الفاظ کا چناؤ جملوں کی بناوٹ، بات نپے تلے انداز میں پیش کرنا ان کی تحریر کا وصف ہے۔ وہ فلسفیانہ انداز بھی اپناتی ہیں جس سے ان کے گہرے شعور کا ادراک ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ اپنے افکاریوں پیش کرتی ہیں:

''سچ کی چاندی جیسی چمک بڑی بھاری پڑتی ہے۔ جھوٹ کی ٹوکنگا جمنی چمک ہے دل بھی ٹھنڈا اور آنکھیں بھی ٹھنڈی رہتی ہیں۔''[۱۲۴]

سحاب سلیس اور شگفتہ انداز میں سفر نامے کے تاثرات بیان کرتی ہیں۔ محاورات کا بر محل استعمال ان کی تحریر میں چاشنی لاتا ہے۔ سفر نامے میں ملکوں کے واقعات بیان کرتے ہوئے تاریخی حوالوں سے بھی معلومات مہیا کی ہیں۔ سفر نامے میں مصنفہ نے اپنی زندگی کو بھی بیان کیا ہے۔ نائیجریا کے سفر نامے میں ان کی اپنی ذات مرکز توجہ رہی ہے اور انہوں نے اپنے مسائل کو بیان کیا ہے اس سے گرد و پیش کے بارے بہت کم معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ ان میں سحاب کا انداز سنجیدہ اور سپاٹ ہے۔ فقرات نہ زیادہ طویل لکھے ہیں اور نہ ہی مختصر۔ لفظوں کو برتنے کا سلیقہ خوب جانتی تھیں موسموں کا ذکر ہو یا طرز معاشرت کا بیان۔ تمام واقعات کو مفصل انداز میں پیش کر دیتیں۔

افسانے سے سفر نامے تک ادبی سفر کرتے کرتے سحاب کے انداز تحریر میں نمایاں فرق پڑھنے کو ملتا ہے۔ افسانوں میں مصنفہ تخیلی سہاروں پر کرداروں کے تانے بانے بنتی ایک پلاٹ تشکیل دینے کی کوشش کرتی ہیں جہاں حقیقت نگاری کی بجائے تخیل کا غلبہ رہتا ہے۔ پھولوں، کلیوں اور موسموں کے ذریعے دلی کیفیات کی ترجمانی کرتی کہیں یاسیت کا شکار لڑکی کا روپ دھار لیتی ہے اور کہیں سکول یا کالج کی منچلی لڑکی اپنی شرارتوں سے اپنا اور اپنی دوستوں کا دل بہلاتی نظر آتی ہے۔ افسانوں میں تشبیہ و استعارے کا استعمال عمومی زندگی کی عمومی مثالوں سے پیش کرتی ہیں۔ خیالات کی پختگی کا فقدان پایا جاتا ہے۔ بات کو سیدھے سادھے پیرائے میں بیان کرنے کی بجائے علم بیان سے کام لیتی ہیں۔ شاعرانہ پیرائے میں بات

کرنے کا انداز تقریباً تمام افسانوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ افسانوں میں زندگی کا حقیقی تصور کم کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ مصنفہ کی کم عمری بھی ہے۔ کم سنی میں لکھے جانے والے افسانوں میں حقیقت کو جاننے اور پرکھنے کا شعور بھی تخیلی حد تک ملتا ہے۔ ان کا افسانوں کا مجموعہ ۱۹۴۶ء میں منظر عام پر آیا تھا جب ان کی عمر تقریباً سولہ برس تھی۔ ان کا خاکوں کا مجموعہ ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ اس لحاظ سے ۴۹ سال بعد ان کی کتاب منظر عام پر آئی۔ اس دور میں انہوں نے ادب سے برائے نام واسطہ رکھا۔ البتہ ادبی محفلوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتیں اور ان کا حلقہ احباب بھی اردو ادب کی نامور شخصیات تھیں۔ یوں ان کے خیالات اور اسلوب میں وقت کے ساتھ ساتھ پختگی آتی گئی جس کا واضح فرق ان کی تحریروں میں نظر آیا ہے۔

افسانوں کے برعکس سفر نامے میں سحاب قزلباش سیدھے سادے انداز میں اپنا مدعا پیش کرتی ہیں۔ سفر نامے کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے گہرے مطالعے اور مشاہدے کو شعار بنا کر حقیقی پہلوؤں کو بیان کرتی ہیں۔ تخیلی کارفرمائی بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ ان کی کھوجتی نظر مقامات اور اشخاص کا مطالعہ کرتی ہے اور یوں تشبیہ و استعارہ کا استعمال کم ہے۔ محاورات کا برمحل استعمال کیا گیا ہے۔ سفر نامے میں ان کی تحریر کے اندر سنجیدگی اور متانت کا عنصر نمایاں ہے وہ نہ زیادہ طویل فقرے لکھتی ہیں اور نہ بالکل مختصر بلکہ بات کو واضح انداز میں بیان کرنے کے لیے موزوں الفاظ میں جملے تشکیل دیتی ہیں۔ سفر نامے میں کہیں کہیں بات کرتے ہوئے ماضی کے واقعات کو بیان کرنے لگتی ہیں۔ ایران کے سفر نامے میں مصنفہ نے اپنی عادت سے روشناس کرایا کہ سکرپٹ لکھ کر پڑھنے کی عادی نہیں ہیں بلکہ فی البدیہہ جملے بولتی چلی جاتی ہیں۔ ان کے سفر نامے میں اس کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ روانی میں اپنے خیالات وافکار بیان کرتی جاتی ہیں اور سفر نامے کو دوبارہ پڑھنے کی کوشش نہیں کی اس وجہ سے بعض مقامات پر وہ ایک ہی بات کو دہرانے لگتی ہیں بار بار ایک بات کہنے سے سفر نامے کا تاثر مجروح ہوتا ہے اور کہی ہوئی بات دوبارہ کہنے سے قاری کی تحریر سے دلچسپی کم ہونے لگتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فیروزالدین، مولوی، فیروز اللغات اردو جامع، (لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، ۲۰۰۵ء)، ص ۸۳۷

۲۔ سحاب قزلباش، بدلیاں، (دلی: ہندوستانی پبلشرز، ۱۹۴۶ء)، ص ۲۹۔۳۰

۳۔ ایضاً، ص ۳۳

۴۔ سحاب قزلباش، ''نین ہین کو راہ دکھاؤ''، مشمولہ بدلیاں، ص ۹۷

۵۔ سحاب قزلباش، ''تاروں کی چھیا میں''، مشمولہ بدلیاں، ص ۱۷۹

۶۔ سحاب قزلباش، ''کیا دستور دنیا یہی ہے''، مشمولہ بدلیاں، ص ۱۵۸

۷۔ مظفر علی سید، مرتبہ، سخن در سخن، (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۴ء) ص ۱۴۷

۸۔ سحاب قزلباش، ''تعارف''، میرا کوئی ماضی نہیں، (کراچی: فضلی سنز، ۱۹۹۵ء)، ص ۶

۹۔ پرویز پروازی، ڈاکٹر، پروفیسر، پس نوشت اور پس نوشت :خود نوشتوں کا جائزہ (لاہور: نیا زمانہ پبلیکیشنز، س ن)، ص ۲۵۹

۱۰۔ مظفر علی سید، ص ۱۴۷

۱۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، میرا جی ایک مطالعہ (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۱)، ص ۴۰۲۔

۱۲۔ مظفر علی سید، ص ۱۴۸

۱۳۔ اخلاق احمد دہلوی، یادوں کا سفر (لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء)، ص ۲۱۷

۱۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، میرا جی شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۶ء)، ص ۲۲

۱۵۔ سحاب قزلباش، ''میرا جی''، مشمولہ میرا کوئی ماضی نہیں، ص ۲۶

۱۶۔ فیض احمد فیض، زنداں نامہ، (دہلی: کبیر بک ڈپو، ۱۹۵۵ء)، ص ۸

۱۷۔ سحاب قزلباش، ''فیض احمد فیض''، مشمولہ میرا کوئی ماضی نہیں، ص ۶۰

۱۸۔ ذوالفقار علی بخاری، سرگزشت، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع اول، ۲۰۱۱ء)، ص ۱۱۳

۱۹۔ سحاب قزلباش، ''تراشیدم پرستم شکستم (بخاری صاحب)''، مشمولہ میرا کوئی ماضی نہیں، ص ۱۱۰

۲۰۔ سحاب قزلباش، ''نخشب جارچوی''، مشمولہ میرا کوئی ماضی نہیں، ص ۱۵۷

۲۱۔ مجتبیٰ حسین (مرتبہ)، آغا شاعر حیات و شاعری (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۷۰ء)، ص ۱۶

۲۲۔ سحاب قزلباش، ''چند باتیں''، مشمولہ روشن چہرے، (کراچی: اشارات پبلی کیشنز)، ص ۹

۲۳۔ سحاب قزلباش، ''ہمارے زمانے کی بیگم لیاقت''، مشمولہ روشن چہرے، ص ۲۳

۲۴۔ رضی ابدالی، سید، محمد، رہبران پاکستان، (کراچی: ابدالی اکیڈمی، ۲۰۰۳)، ص ۹۶

۲۵۔ سحاب قزلباش، ''نشتر صاحب''، مشمولہ روشن چہرے، ص ۳۰

۲۶۔ سرفراز حسین مرزا، ڈاکٹر، تحریک پاکستان میں مسلم خواتین کا کردار، (لاہور: نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۰۴

۲۷۔ سحاب قزلباش، ''نشتر صاحب''، مشمولہ روشن چہرے، ص ۳۳۔۳۴

۲۸۔ سحاب قزلباش، ''بیگم نسیم ولی خان''، مشمولہ روشن چہرے، ص ۳۹۔۴۰

۲۹۔ سحاب قزلباش، ''ممتاز حسن خان''، مشمولہ روشن چہرے، ص ۵۰

۳۰۔ پرویز پروازی، ڈاکٹر، پروفیسر، ص ۲۶۱

۳۱۔ سحاب قزلباش، ''ساحر لدھیانوی''، مشمولہ روشن چہرے، ص ۶۷

۳۲۔ سحاب قزلباش، ''رضیہ آپا''، مشمولہ روشن چہرے، ص ۷۳

۳۳۔ سحاب قزلباش، ''للتا احمد''، مشمولہ روشن چہرے، ص ۸۵

۳۴۔ www.thehindu.com/features/friday-review/enchantress-ones-more/aricles53257.ece

۳۵۔ سحاب قزلباش، ''پیرس کا میوزیم لوغ''، مشمولہ ملکوں ملکوں شہروں شہروں، (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۲)، ص ۱۰۱۔

۳۶۔ عصمت جمیل، ڈاکٹر، نسائی شعور کی تاریخ، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۱۲) ص ۲۰۴

۳۷۔ ایضاً، ص ۲۰۳

۳۸۔ سحاب قزلباش، ''کس قدر رنگین ہے راہ محبت کا فریب''، مشمولہ بدلیاں، ص ۴۷

۳۹۔ سلیم آغا، قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت اول، ۲۰۰۰)، ص ۵۳۸۔۵۳۹

۴۰۔ سحاب قزلباش، ''نین ہین کو راہ دکھاؤ''، مشمولہ بدلیاں، ص ۹۵

۴۱۔ سحاب قزلباش، ''آگ جل رہی ہے''، مشمولہ بدلیاں، ص ۶۵

۴۲۔ سحاب قزلباش، ''ٹوٹا ہوا کھلونا''، مشمولہ بدلیاں، ص ۱۰۷

۴۳۔ سحاب قزلباش، ''نیلی فراک''، مشمولہ بدلیاں، ص ۱۴۳

۴۴۔ سحاب قزلباش، ''کس کا منہ دیکھا تھا''، مشمولہ بدلیاں، ص ۱۴۷۔۱۴۸

۴۵۔ سحاب قزلباش، ''گولیاں''، مشمولہ بدلیاں، ص ۱۷۱

۴۶۔ سحاب قزلباش، ''نیلی فراک''، مشمولہ بدلیاں، ص ۱۲۶

۴۷۔ سحاب قزلباش، ''کس کا منہ دیکھا تھا''، مشمولہ بدلیاں، ص ۱۴۳

۴۸۔ سحاب قزلباش، ''کیا دستور دنیا یہی ہے''، مشمولہ بدلیاں، ص ۱۵۷

۴۹۔ سحاب قزلباش، ''۔۔۔ تم کو خبر ہونے تک''، مشمولہ بدلیاں، ص ۲۵۷

۵۰۔ سحاب قزلباش، ''جوش چا''، مشمولہ میرا کوئی ماضی نہیں، ص ۱۱۔۱۲

۵۱۔ سحاب قزلباش، ''میرا جی''، مشمولہ میرا کوئی ماضی نہیں، ص ۱۶۔۱۷

۵۲۔ ایضاً، ص ۲۰

۵۳۔ ایضاً، ص ۲۳

۵۴۔ مظفر علی سید، ص ۱۵۰

۵۵۔ ایضاً، ۱۵۱

۵۶۔ ایضاً، ۱۵۱

۵۷۔ سحاب قزلباش، ''ن م راشد''، مشمولہ میرا کوئی ما ضی نہیں، ص ۲۸

۵۸۔ ایضاً،، ص ۳۹

۵۹۔ مظفر علی سید، ص ۱۵۱۔۱۵۲

۶۰۔ https://www.dawn.com/news/87676

۶۱۔ سحاب قزلباش، ''فیض احمد فیض''، مشمولہ میرا کوئی ما ضی نہیں، ص ۶۰

۶۲۔ سحاب قزلباش، ''میری عصمت آپا''، مشمولہ میرا کوئی ما ضی نہیں، ۱۲۲

۶۳۔ ایضاً، ۱۲۴

۶۴۔ ایضاً، ۱۲۴

۶۵۔ ایضاً، ۱۲۵

۶۶۔ ایضاً، ۱۳۶

۶۷۔ ایضاً، ۱۳۳۔

۶۸۔ ایضاً، ص ۱۴۱۔

۶۹۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، خاکہ نگاری (فن و تنقید)، (راولپنڈی: شاخسار پبلشرز، ۱۹۹۰ء) ص ۱۳

۷۰۔ سحاب قزلباش، ''نخشب جارچوی''، مشمولہ میرا کوئی ما ضی نہیں، ص ۱۴۶

۷۱۔ ایضاً،۱۴۶

۷۲۔ ایضاً،ص۱۵۸

۷۳۔ ایضاً،ص۱۵۵

۷۴۔ ایضاً،ص۱۵۳

۷۵۔ ایضاً،ص۱۵۱

۷۶۔ سحاب قزلباش، ''بیگم شاہنواز''، مشمولہ روشن چہرے، ص۱۵

۷۷۔ ایضاً،۲۶

۷۸۔ ایضاً،۳۰

۷۹۔ ایضاً،۳۹

۸۰۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، ص۱۲

۸۱۔ سحاب قزلباش، روشن چہرے، ص۵۶

۸۲۔ ایضاً،ص۶۰

۸۳۔ ایضاً،ص۶۱

۸۴۔ مبین مرزا، (مرتبہ)، اردو کے بہترین شخصی خاکے (پہلی جلد)، (اسلام آباد: الحمرا پبلشنگ،۲۰۰۲)، ص۱۱۔۱۲

۸۵۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو نثر کا فنی ارتقائی، (لاہور: الوقار پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء)، ص۳۷۰۔۳۷۱

۸۶۔ سحاب قزلباش، ''قرۃ العین حیدر''، مشمولہ روشن چہرے، ص۶۲

۸۷۔ ایضاً،ص۶۳

۸۸۔ پرویز پروازی، ص۲۶۱

۸۹۔ سحاب قزلباش، ''ساحر لدھیانوی''، مشمولہ روشن چہرے، ص۶۹

۹۰۔ ایضاً، ص۷۰

۹۱۔ پرویز پروازی، ص۲۶۱

۹۲۔ سحاب قزلباش، ''نظر حیدر آبادی''، مشمولہ روشن چہرے، ص۷۶

۹۳۔ ایضاً، ص۷۷

۹۴۔ انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، (لاہور: عزیز بک ڈپو، طبع پنجم، ۲۰۰۶)، ص۶۲۰

۹۵۔ سحاب قزلباش، ''للتا احمد''، مشمولہ روشن چہرے، ص۸۳

۹۶۔ ایضاً، ص۸۴

۹۷۔ ایضاً، ص۸۲

۹۸۔ ایضاً، ص۹۸

۹۹۔ ایضاً، ص۹۰

۱۰۰۔ ایضاً، ص۱۰۰

۱۰۱۔ ایضاً، ص۱۰۳

۱۰۲۔ ایضاً، ص۱۰۸

۱۰۳۔ ایضاً، ص۱۱۰

۱۰۴۔ ایضاً، ص۱۱۰

۱۰۵۔ ایضاً، ص۱۱۸

۱۰۶۔ ایضاً، ص۱۲۰

۱۰۷۔ ایضاً، ص۱۲۳

۱۰۸۔ ایضاً،ص۱۲۴

۱۰۹۔ سحاب قزلباش،"دیباچہ"،مشمولہ،ملکوں ملکوں شہروں شہروں،(کراچی: حوری نورانی،مکتبہ دانیال، ۲۰۰۲)،ص۷۔۸

۱۱۰۔ انور سدید، اردو ادب میں سفر نامہ،(لاہور:ڈاکٹر وحید قریشی،سیکرٹری جنرل مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،س ن)،ص۴۷

۱۱۱۔ سحاب قزلباش،ملکوں ملکوں شہروں شہروں،ص۱۵

۱۱۲۔ ایضاً،ص۷۶

۱۱۳۔ ایضاً،ص۷۶

۱۱۴۔ ایضاً،ص۷۶

۱۱۵۔ گوپی چند نارنگ، (مرتبہ) بیسویں صدی میں اردو ادب،(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸)، ص۳۴۹۔۳۵۰

۱۱۶۔ سحاب قزلباش،ملکوں ملکوں شہروں شہروں،ص۵۹

۱۱۷۔ ایضاً،ص۹۸

۱۱۸۔ ایضاً،ص۱۱۹

۱۱۹۔ ایضاً،ص۵۰

۱۲۰۔ ایضاً،ص۱۲

۱۲۱۔ ایضاً،ص۱۴

۱۲۲۔ ایضاً،ص۸۹

۱۲۳۔ ایضاً،ص۹۱

۱۲۴۔ ایضاً ۶۱

باب چہارم

سحاب قزلباش کا شعری اسلوب

تعارف

سحاب قزلباش نے کم عمری میں ہی شاعری کا آغاز کر دیا تھا۔ ان کے والد آغا شاعر قزلباش مشاعروں میں شرکت کرتے تو بعض اوقات اپنی اکلوتی بیٹی سلطانہ (سحاب) کو بھی ساتھ لے جاتے۔ وفات سے قبل ایک بار آل انڈیا ریڈیو سروس کے مشاعرے میں بھی سحاب کو ساتھ لے گئے۔ ان کے حلقہ احباب میں اس دور کے نامور شعرا شامل تھے۔ جن کا گھر کے مہمان خانے میں اکثر قیام وطعام کا اہتمام رہتا اور مشاعروں کی محفلوں کا انعقاد بھی کیا جاتا۔ سحاب کے سامنے شعر وادب کی فضا قائم تھی۔ ایسی فضا میں ذہنی شعور نے جلا پائی اور والد کی وفات کے بعد نہایت کم عمری میں ہی شعر پڑھنے شروع کر دیے۔ سحاب نے چونکہ آل انڈیا ریڈیو سروس میں بھی کام کیا۔ وہاں بھی پروگراموں میں مختلف شعراء کے اشعار پیش کرتیں اور ساتھ ہی اپنی شاعری سے بھی سامعین کو محظوظ کرنے کا موقع میسر آتا۔

سحاب قزلباش نے جب شاعری کا آغاز کیا اردو ادب شاعری کے مروجہ معیار سے نکل کر جدت افکار لیے نئی منزلیں تلاشتا بحرور موز کی قید سے دور نئی منزلیں متعین کر رہا تھا۔ اس ادب کو تراشنے میں فیض احمد فیض، ن م راشد اور میرا جی نمایاں کرداروں میں سے تھے۔ اسی دور میں ملکی، سیاسی و معاشرتی حالات میں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ آزادی کی تحریک زور پکڑ چکی تھی۔ شعرائے کرام نے اپنے کلام سے جذبہ آزادی کو مزید پروان چڑھایا اور جابرانہ تسلط سے انحراف نے شاعری کو محبوب کے گیسوؤں اور سرو قد کا نقشہ کھینچنے کی بجائے معاشرتی و معاشی بدحالی، سفاکی اور ناانصافی کی تاریخ رقم کی۔ حق خودارادی کے جذبے سے معمور شاعری مرد و خواتین دونوں میں مقبول عام ہوئی اور حق کی بازگشت لیے خواتین نے غمزہ وغازہ کو بھول کر دوپٹے کا پرچم بنا لینے کے لیے کمر کس لی۔ ایسے میں سحاب بھی پیش پیش رہیں اور اجلاسوں میں بلند پایہ شعرائے کرام کے کلام سناتیں اور بعض اوقات اپنا کلام پیش کرتیں۔

سحاب نے شعر وادب میں اپنی صلاحیتوں کو آزمایا لیکن ریڈیو سروس میں ملازمت کے سبب اسے مکمل وقت نہ دے سکیں یوں افسانوں کے صرف ایک مجموعے کے کی اشاعت کے بعد کوئی اور کتاب عرصہ دراز تک منظر عام پر نہ آئی۔ انھیں شاعری کا ذوق اوائل عمری سے رہا۔ مشاعروں میں وقتاً فوقتاً اپنا کلام پڑھ کر داد سمیٹتیں۔ عمر کے آخری حصے

میں انھوں نے اپنی بکھری کاوشوں کو سمیٹااور یوں خاکہ، سفر نامہ اور شعری مجموعہ تواتر کے ساتھ منظر عام پر آئے۔ سحاب کے شعری مجموعے کے حوالے سے زاہدہ حنااپنے کالم میں یوں لکھتی ہیں۔

''شاعری انھیں ورثہ میں ملی تھی خوش آواز اور خوش گلو تھیں، دلی سے ہی انھوں نے مشاعرے پڑھنے شروع کر دیے تھے، کراچی میں بھی انھوں نے کئی مشاعرے لوٹے۔ اور اس کے بعد انگلستان، امریکہ، کینیڈا کہاں کہاں ان کی آواز نہیں گونجی۔ غمِ روزگار نے شعر و سخن کی زلفیں سنوارنے کا وقت کم کم دیا۔ کچھ مزاج میں تلون تھا کچھ اپنے آپ سے بے اعتنائی، بہت سی غزلیں اور نظمیں کھوئی گئیں۔ مٹھی بھر اشعار اکٹھا ہوئے تو چند برس پہلے ایک مختصر سا مجموعہ آگیا۔''[1]

سحاب قزلباش کا مجموعہ 'لفظوں کے پیرہن' ان کا واحد شعری مجموعہ ہے جس میں ان کی زندگی کے مختلف ادوار میں لکھے گئے شعری کلام کو جامع شکل دی گئی ہے۔ انھوں نے شاعری کی مختلف اصناف میں ہیّت کے تجربات کیے۔ ان کا شعری مجموعہ اشارات پبلی کیشنز سے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا جس میں سلامیہ شاعری، غزل اور نظم کی اصناف شامل ہیں۔ نظموں میں انہوں نے پابند اور آزاد دونوں میں طبع آزمائی کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک طویل نظم 'لینڈ لیڈی' بھی لکھی۔ زمانی اعتبار سے دیکھا جائے تو سحاب نے غزل سے آغاز کیا۔

کتاب کی تقریش اردو ادب کے مایہ ناز ادیب اور شاعر جمیل جالبی نے لکھی ہے۔ سحاب کا تعارف جمیل جالبی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

''سحاب ایران نژاد، نامور قزلباش خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ بڑے باپ اور بڑے شاعر حضرت شاعر قزلباش کی بیٹی۔ خاندانی روایت کی رکھوالی۔ وضع داری کو دل سے نبھانے والی۔ شرافت کی پاسبان۔ سب سے محبت اور سب کی مدد کرنے والی۔ اور دوستیوں کو مرتے دم تک نبھانے والی۔''[2]

شعری مجموعہ 'لفظوں کے پیرہن' کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کتاب کے پہلے حصے میں پانچ سلام پیش کیے گئے ہیں، دوسرے حصے میں پچیس غزلیں، تیسرے حصے میں سولہ نظمیں اور آخری حصہ میں ایک طویل نظم 'لینڈ لیڈی' شامل ہے۔

شعری مجموعہ 'لفظوں کے پیرہن' میں پہلا حصہ مذہبی موضوعات پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے عقیدت مندانہ انداز میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ان کے موضوعات یوں ہیں۔

۱۔ محرم کا احترام کرو

۲۔ حضرت خدیجہؓ کو سلام

۳۔ دمشق میں حضرت زینبؓ کے مزار پر

۴۔ شہیدان وطن کو سلام

۵۔ اقبال کی نذر

شعر وادب میں سلامیہ شاعری کا آغاز فارسی زبان سے ہوا بعد ازاں اردو ادب میں یہ صنف مروج ہوئی۔ سلام میں واردات قلب وذہن کے مضامین کو بیان کیا جاتا ہے۔ عروضی ترکیب کے اعتبار سے سہرا، غزل اور سلام ایک ہی چیز ہے لیکن مضامین کے اعتبار سے ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ سلام میں عموماً مذہبی موضوعات جیسے حضرت امام حسن و حسین، شہید کربلا، بنت رسول پر اشعار لکھے جاتے ہیں۔ اردو ادب میں مرثیے کی روایت کے ساتھ سلام کا بھی آغاز ہوا۔ مذہبی موضوعات خاص طور پر واقعہ کربلا کی منظر کشی سے قبل سلام کا نذرانہ بطور خاص پیش کیا جاتا ہے۔ سلام یوم عاشور کے موقع پر مرثیہ پڑھنے سے قبل مطلع کی حیثیت رکھتا ہے۔[۳]

سحاب قزلباش کے سلام موضوع کے اعتبار سے مذہب اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہیں۔ ان میں احترام انسانیت، جلیل القدر رہنمائے انسانیت کی علمبردار خواتین اور وطن عزیز کی سربلندی کے لیے جاں نثار کرنے والے شہدا اور نظریہ پاکستان کے بانی کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔

ان میں سب سے پہلا سلام 'محرم کا احترام کرو' ہے جس میں محرم الحرام سے عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے اور نبی پاک کی آل پر محرم الحرام کے موقع پر پرسہ دینے کا کہا گیا ہے۔ شاعرہ تمام مسلمانوں کو محرم الحرام کی حقیقت سے روشناس کراتی ہیں۔ محرم الحرام منانے کا مقصد اسلام کی سربلندی اور اس کے خلاف حائل باطل قوتوں کو شکست دینا ہے۔ اسلام کا پرچم سربلند رکھنے کے لیے حضرت امام حسینؓ نے اپنے خاندان سمیت اللہ کی راہ میں جان دے دی اور نیزے پر سر کٹا کر دین اسلام کا بول بالا کیا۔ محرم الحرام کے موقع پر اہل تشیع یکم محرم الحرام سے لے کر ۱۰ محرم الحرام تک حضرت امام حسینؓ کے خاندان کی کوفہ میں برداشت کی گئی صعوبتوں کا حال بیان کرتے ہیں اور حضرت امام حسین کی عزم وہمت اور استقلال کے ساتھ ساتھ یزید کی ظلم وزیادتیوں پر اشکبار ہوتے ہیں۔ حضرت امام حسینؓ نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اللہ واحد مطلق کے سوا کسی کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرنا چاہیے۔ مقطع میں سحاب یوں نذرانہ عقیدت پیش کرتی ہیں۔

شہید مرتے نہیں ہیں، شہید زنداں ہیں

سحاب اُٹھ کے شہیدوں کو تم سلام کرو [۵]

حضرت خدیجہؓ کو سلام چار اشعار پر مشتمل ہے جس میں حضرت خدیجہؓ کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ حضرت خدیجہؓ قبیلہ قریش کی معزز خاتون، جنھوں نے حضور پاکؐ کی طہارت اور ایمانداری کی اصناف سے متاثر ہو کر ان سے شادی کی۔ حضرت خدیجہؓ حضور پاکؐ کی پہلی بیوی تھیں۔ نبوت کے بعد جب حضور پاکؐ نے پیغمبر ہونے کی خوشخبری سنائی اور دعوت حق کی تبلیغ کی تو خواتین میں سے حضرت خدیجہ اول خاتون تھیں جو نبی پاک پر ایمان لے آئیں اور نبی پاک کی ہر مشکل وقت میں معاون و مددگار رہیں۔ نبی پاک کی تمام اولاد حضرت خدیجہؓ سے ہوئی۔ ان کی زندگی میں نبی پاک نے دوسری شادی نہیں کی۔ شاعرہ حضرت خدیجہؓ کو خراج تحسین پیش کرتی ہیں کہ انہی سے اللہ تعالیٰ نے نیک و صالح اور اسلام کا بول بالا کرنے والی اولاد دی۔ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے چار بیٹیاں اور دو بیٹوں سے سرفراز کیا۔ آپ کے دونوں بیٹے پیدائش کے بعد وفات پاگئے۔ بیٹیوں نے طویل عمر پائی۔ ان میں سے حضرت فاطمہؓ کی نرینہ اولاد حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ نے آپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسلام کی سرفرازی کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر دیے۔ شاعرہ حضرت خدیجہؓ کو خراج تحسین پیش کرتی ہیں کہ ان کی اولاد سے یہ سلسلہ چلا اور خاتون جنت حضرت فاطمۃ الزہراؓ انہی کی بیٹی تھیں جن کی اولاد سے بارہ اماموں کو مینارہ نور ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔

یہ سردار جہاں خاتون جنت ان کی بیٹی تھیں

سحاب ان ہی سے تو بارہ اماموں نے ضیا پائی [۶]

اہل تشیع فرقہ بارہ اماموں کو مانتے ہیں جو آنحضرت محمد ﷺ کے اہل بیت سے ہیں۔ یہ سلسلہ حضرت علیؓ سے شروع ہو کر آنے والے امام مہدی تک چلتا ہے۔

'دمشق میں حضرت زینبؓ کے مزار پر' لکھی گئی نظم میں شاعرہ نے مقام کربلا کی تاریخی اہمیت سے متعارف کروایا۔ انھوں نے مقام کربلا کے حوالے سے متعدد تلمیحات اور استعارات کے ذریعے اس عظیم قربانی کی یاد تازہ کی ہے نظم میں مخصوص معنوی فضا کا تاثر نظر آتا ہے کوچہ شام کے تمام مناظر کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ سحاب نے عابد بیمار، بنت حیدر اور سرِ مظلوم کی تلمیحات استعمال کر کے کربلا کی حقیقی منظر کشی کی۔

ابتدائی دور میں محرم الحرام کے حوالے سے عقیدت مندانہ اظہار اور ثواب کے لیے لکھے جاتے۔ سلام میں عموماً بیان کی سادگی اور یک رنگی کا عنصر غالب رہتا۔ اب بھی شعراء کرام ثواب کے حصول کے لیے سلام پیش کرتے ہیں۔ ان میں مثلث، مربع اور ترکیب بند کی ہیتوں میں ملتے ہیں۔[۶]

انداز بیاں سادہ اور بیانیہ ہے۔ تلمیحات کا استعمال یوں کیا گیا ہے۔

عابد بیمار کے ساتھ آیا تھا
ننگے سر سب کو جب پھرایا تھا [۷]

یہ جگہ وہ ہے جہاں اب بھی ہے گریہ جاری
سر مظلوم یہاں طشت میں رکھا تھا کبھی [۸]

نظم 'شہیدان وطن کو سلام' ترکیب بند انداز میں لکھی گئی ہے۔ نظم میں وطن کی سربلندی اور حفاظت کے لیے جانوں کے نذرانے پیش کرنے والے محبان وطن کو سلام پیش کیا گیا ہے۔ شہیدان وطن جنھوں نے اپنی جانوں کی پروا کیے بنا وطن کے خلاف اٹھنے والی ہر میلی آنکھ کا مقابلہ کیا۔ وہ یقیناً محمد کے جانباز سپاہی ہیں جنھوں نے حقیقی معنوں میں عزم وہمت کی روشن مثال قائم کیں۔

نظم میں باغ پاکستان، ہلالی، مرد حق، مرد شہید جیسے استعارے موزوں انداز میں برتے گئے ہیں جن سے شاعرہ اپنے خیالات کے اظہار میں جدت لانے کی کوشش کرتی ہیں اور پرانے الفاظ و تراکیب کو نئے انداز سے ترتیب دیتی ہیں۔ بعض اوقات اس کوشش میں شاعرہ دور از کار تشبیہات واستعارات کے سہارے لے کر بھی الفاظ کو تاثر کا عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہتی ہیں۔ شاعرہ تقلیدی روش سے ہٹ کر اپنے لیے نئے راستے ہموار کرتی ہے اور اپنے لیے بیان کا ایک نیا اسلوب متعارف کراتی ہیں جو فکر کی بلندی اور اظہار کی بالیدگی کا ترجمان ہوتا ہے۔

نظم 'اقبال کی نذر' میں علامہ اقبال جیسی جلیل القدر شخصیت کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ شاعرہ نے اقبال کے تشخص اور نظریہ پاکستان کو احسن انداز سے بیان کیا ہے۔ اقبال نے فلسفہ خودی کے ذریعے انسانی تشخص کو اجاگر کیا۔ انھوں

نے اس کامیابی سے بصیرت سے کام لیا کہ اس طرح کی کوئی مثال شاعری کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان کے الفاظ تاریخی گواہی پیش کر کے مستند ہونے کی تصدیق پیش کرتے ہیں علامہ اقبال کی شاعری میں عشق مجازی سے زیادہ عشق حقیقی کی لگن ہے

حصہ غزل

اردو غزل فارسی غزل کے زیر سایہ پروان چڑھی اس لیے زبان کی شکست وریخت میں فارسی کے الفاظ کا بہ کثرت استعمال رہا۔ اس دور کی غزل میں عموماً محبوب کا روایتی تصور رائج تھا۔ محبوب کا ایک مخصوص پیکر تراشا جاتا، جس میں محبوب کی سراپا نگاری، کج ادائی، بے وفائی سب مروّجہ اصولوں پر غزل میں سند قبولیت پاتے۔ اس میں تشبیہ، استعارے اور تلمیحات کی مدد سے اسلوب تشکیل دیا جاتا۔ اس دور کی غزل مکمل طور پر فارسی غزل کا تتبع تھی جس میں انفرادیت کی بجائے تقلید کا عنصر نمایاں رہا ہے۔[9]

بیسویں صدی کے آغاز میں غزل کی صنف میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ غزل اپنے مروجہ نظام سے نکل کر نئے فکری و فنی رجحانات کی طرف گامزن ہوئی۔ اس دور کے غزل گوؤں نے تقلید کی روش کو ترک کر کے اصلاح معاشرت اور زندگی کے نصب العین کی طرف توجہ مبذول کرائی اور اردو شاعری کو نئی جہد سے روشناس کیا۔ اس کاوش میں اگرچہ کلاسیکی غزل کا اثر غالب رہا تاہم نئے فکری رجحانات، رموز و علائم اور اسالیب سے قدیم و جدید غزل کا خوبصورت امتزاج سامنے آیا۔[10] ارشد محمود ناشاد اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

> ''جدید فکری رجحانات کو پوری معنویت کے ساتھ متشکل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ غزل کی لفظیات میں نئے الفاظ و تراکیب بھی شامل کیے جائیں اور پرانے ذخیرہ الفاظ کو بھی کہنگی کے طلسم سے نکال کر نیا معنویاتی پس منظر عطا کیا جائے۔''[11]

غزل آمد و آورد کا مجموعہ ہے غزل کا ہر شعر ایک دوسرے سے جدا ہونے کے باوجود اپنے اندر ایک مکمل کہانی رکھتا ہے۔ اختر انصاری غزل کے بارے اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> ''غزل آمد و آورد، بلند و پست، تلخ و شیریں، داخلیت و خارجیت، رکاکت و متانت، مادیت و روحانیت، تخلیقیت و ارضیت و ماورائیت کا ایک عجیب و غریب، حسین و جمیل، رنگا رنگ، پر بہار و پر کیف مجموعہ ہے۔''[12]

سحاب کی غزلوں میں سیاسی و معاشرتی مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔انھوں نے سیاست، معاشرتی استحصال، دیار غیر میں وطن کی یاد سے معمور دل کی اضطرابی کیفیت، عشق مجازی اور بالخصوص بطور صنف نازک عورت کے استحصال کو موضوع سخن بنایا ہے۔ان کی شاعری میں حقیقت نگاری اور محبت و اخلاص کی چاشنی ہے۔بے رحم سماج اور ظلم و جبر کے خلاف احتجاج بھی ہے۔شاعر حساس طبیعت کے مالک ہوتے ہیں زندگی کو قریب سے پرکھنا اور ان کا اظہار ان کے لیے از بس ضروری ہے شعرا اور ادیب اپنے اپنے انداز سے ایک خاص عہد میں پنپنے والے رجحانات، درپیش مسائل اور ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔

جاگیر دارانہ نظام اور طبقہ امراء نے معاشرتی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔انسانیت کی تذلیل، جبر، ظلم و تشدد کی داستانیں ہر دور میں رقم کی جاتی رہی ہیں۔انسان کا معیار اور اس کی قدر و منزلت کا تعین اس کے جاہ و منصب سے لگایا جاتا ہے۔پر تعیش زندگی امراء کا وصف اور غربت حقارت کی حقدار بنی ہے۔سحاب انسانیت کو مذہب و دولت سے بالاتر تصور کرتی ہیں۔

خود اپنے جیسا ہی انسان زندگی مانگے

یہ کیسا وقت خدائی ہے آدمی کے لیے [۱۳]

سحاب کی شاعری ظلم و جبر کے خلاف باآواز بلند احتجاج ہے اپنے ہی ملک میں ظلم و ناانصافی کی فضا دیکھ کر ان کا دل دکھتا ہے سحاب نے اس وطن کے قیام کے لیے عظیم رہنماؤں کی قیادت میں حق خودارادی کی آواز بلند کی لیکن قیام پاکستان کے بعد جن خوابوں کی تعبیر کی خواہاں ہو کر یہاں آئیں تو سیاسی سازشوں، معاشی و معاشرتی مسائل، رہائش، خوراک، جیسی بنیادی ضرورتوں کے ساتھ دیگر مسائل کا سامنا کرنا پڑا اس ناانصافی پر سحاب مہر بہ لب نہیں رہیں بلکہ اس کا اظہار یوں کرتی ہیں۔

ہمارے پھول، ہمارا چمن، ہماری بہار

ہمیں کو جا نہیں ملتی ہے آشیانے کو [۱۴]

طبقاتی تقسیم اور معاشرتی ناہمواریاں معاشرے کے بنیادی رجحانات ہیں۔طاقتور ہمیشہ کمزور اور محکوم کو ظلم و ناانصافی کا نشانہ بناتا ہے۔اس طبقاتی تقسیم میں مرد کی بالادستی ہمیشہ سے رہی ہے۔عورت کا کردار ایک غلام اور لونڈی کا

ہے۔اسے معاشرے میں سر اٹھا کے اور مردوں کے شانہ بشانہ کھڑا ہونے میں ہمیشہ سے ہی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ سحاب نے معاشرے کی اس حقیقت کا احساس دلایا ہے کہ عورت معاشرے کا سب سے مجبور و محکوم طبقہ ہے۔ عورت کی حیثیت ایک باندی سے زیادہ کچھ نہیں عورت کو ہر حال میں زباں بندی کی تربیت دی جاتی ہے اور زباں بندی پر مجبور کیا جاتا ہے۔ احساسات کا عورت کے دل میں پنپنا جرم بن جاتا ہے کیونکہ احساسات ہی زندگی کی جنگ اور خواہشات کی تکمیل کی روش پر لے جاتے ہیں اور بغاوت و سرکشی کو فروغ دیتے ہیں۔ معاشرے کے انہی اصولوں سے روگردانی پر عورت کو مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں خواتین شعرا نے اپنے حق کے لیے آواز بلند کی اور اپنے الفاظ کے ذریعے عورت کے استحصال کو ظلم و بربریت سے تعبیر کیا۔ ان میں کشور ناہید، پروین شاکر اور فہمیدہ ریاض قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے عورت کے مساوی حق کے لیے بیشتر نظمیں لکھیں۔ سحاب نے عورت کا نوحہ تذلیل ذات کا احساس لیے یوں بیان کیا ہے۔

ہم اہل ظرف ابھی تک ہیں ایک جنس لطیف
جنھیں کچل دیا دنیا نے آزمانے کو [۱۵]

اسی طرح ایک اور شعر میں یوں لکھتی ہیں:

لبوں پہ مہر ہو، دل لاکھ ٹکڑے ٹکڑے ہو
زباں سے حرف نکالیں تو جرم ہے اپنا [۱۶]

شاعرہ مذہب اور فرقہ واریت سے ہٹ کر انسانیت کی بات کرتی ہیں۔ جہاں مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائیت کا جھگڑا نہ ہو بلکہ تمام انسان ان مذہبی تصورات اور عقیدوں سے ہٹ کر انسانی تشخص کو پہچان پائیں اور کسی سے دوستی اور دشمنی کا معیار مذہبی بنیادوں پر استوار نہ کریں۔ یہاں وطن کی پہچان اس کے مذہبی عقیدے سے ہوتی ہے۔ اس دنیا میں انسان کا اپنا وطن نہیں ہے۔ شاعرہ استفسار کرتی ہیں کہ انسان کا بھی کوئی وطن ہے؟

جہاں میں دیر و حرم کے وطن تو دیکھ لیے
مگر کہیں تیرے انساں کا بھی ہے کوئی وطن [۱۷]

مذہبی بنیادوں پر ہی انسان کا دوسرے انسان سے رشتہ استوار ہے۔ مسلمان مسلمان کا دوست اور حبیب ہے۔ ہندو اپنے مذہبی تعلق کی بناء پر یقین اور اعتماد کی فضا محسوس کرتا ہے۔ دنیا میں مذہبی عناد کی بنا پر فرقہ واریت، تشدد پسندی اور نسلی

تعصب کی فضا قائم ہو چکی ہے جس نے احترام انسانیت کو یکسر معدوم کر دیا ہے۔ شاعرہ گلشن میں لگے پھولوں اور انسانی دنیا کے فرق کو یوں واضح کرتی ہیں۔

کبھی سنا ہے بیری ہو پھول پھولوں کا
یہاں پہ آدمی ہی آدمی کا دشمن ہے [۱۸]

خدا کی بارگاہ میں حاضری اسے نصیب ہوتی ہے جو دل سے خدا کو پکارے اور اس کی بارگاہ میں اس کی کبریائی اور عظمت کو دل سے سمجھے اور جانے۔ لیکن اس شخص پر جو مسجد اور مندر کے چکر لگاتا پھرے اور خدا کی عظمت کو دل سے نہ سمجھ سکے اس کی ریاضت بے معنی رہ جاتی ہے۔

اسی بات کو بلھے شاہ نے اپنی شاعری میں بہت پہلے بیان کیا تھا کہ انسان کے دل کے اندر خدا بستا ہے بس اسے دل سے پکارنا پڑتا ہے جب بھی انسان دل سے خدا کو پکارے تو اللہ اپنے بندے کی دعا ضرور سنتا ہے اور اس کی مشکل کشائی کرتا ہے۔

سحاب اس کا اظہار خیال یوں کرتی ہیں۔

وہ نامراد بنا اک غلام دیر و حرم
جسے تصور پروردگار مل نہ سکا [۱۹]

دنیا میں انسان ہی غالب اور انسان ہی مغلوب ہے۔ طاقتور ہمیشہ حاکم بن کر غریب کو محکوم بنانے پر تلا ہوا ہے اور خود کو اس دنیا کا مالک سمجھتا ہے۔ شاعرہ شکوے کے انداز میں اس جبر اور بربریت کے خلاف احتجاج کرتی ہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی نظر دوڑائی جائے خدائی کے دعوئے دار دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے میں شاعرہ کہتی ہیں کہ انھیں پرودگار کہیں نہیں ملا۔

حرم ہو دیر ہو، ہر جا ہے آدمی ہی خدا
مجھے کہیں مرا پروردگار مل نہ سکا [۲۰]

اسی طرح ایک شعر میں یوں شکوہ کرتی ہیں۔

اپنے بندوں کے لہو پہ بھی نظر کر یا رب

تو نے انصاف کو محشر پہ اٹھا رکھا ہے [۲۱]

شاعرہ سجود و عبود کے حوالے سے لکھتی ہیں۔

کہاں کا شوق سجود اب کہاں کے دیر و حرم

جبیں سے ہٹ گیا جب آستان رعنائی [۲۲]

سحاب نے غزلوں میں روایتی انداز اپنایا ہے۔ محبوب کی بے رخی کا عنصر ان کی شاعری میں بھی ہے۔ اس حوالے سے محبوب کے در پر بار بار چکر لگانے پر بھی اس کا دیدار نہیں ہوتا اور جو کوئی بھی اس در پر آس لے کر جاتا ہے بے نیل و مرام واپس لوٹ آتا ہے۔ اسے یوں لکھتی ہیں۔

جو آیا گفتگو کو ترستا چلا گیا

حالانکہ کوئے دوست ہے راہ عدم نہیں [۲۳]

سحاب سیاسی موضوع پر اظہار خیال کرتی ہیں حکومت کے بنائے جانے والے منصوبوں پر طنزیہ انداز میں استفسار کرتی ہیں کہ حکومت کے بنائے جانے والے بڑے بڑے منصوبوں سے غریب عوام کو رزق کی فراوانی میسر آجائے گی۔ جو خیالی منصوبے تشکیل دیے جاتے ہیں ان سے غریب عوام کا پیٹ نہیں بھرا جاسکتا۔

رات دن اک نیا منصوبہ بنانے والو!

پیٹ بھر جائے گا کیا قوم کا ان باتوں سے [۲۴]

اسی طرح سیاسی عناصر کی بے جا مداخلت اور چہروں کے ردوبدل سے فرسودہ نظام کی آماجگاہی کا تذکرہ اس طرح کرتی ہیں۔

پھر چڑھا بھاؤ کچھ قبیلوں کا

پھر ضرورت کسی امین کی ہے [۲۵]

۱۹۹۹ء کے کراچی مشاعرے میں پڑھی جانے والی غزل میں شاعرہ نے مضبوط پاکستان کی کامیابی و کامرانی کے لیے جس عظمت و استقلال کا ثبوت دیا ہے۔ ان کا اظہار یوں کرتی ہیں۔

ہم کو اصرار کہ ہر اک زباں بول اُٹھے
ان کو ضد صاحب گفتار نہ بننے دیں گے
جن زمینوں کو گلستاں بنایا ہم نے
اب انھیں ایٹمی بازار نہ بننے دیں گے [۲۶]

سحاب کی نظم نگاری

حالی نے نظم نگاری کی نئی جہتوں کو اردو میں متعارف کروا کر غزل کی مخصوص روایت، وزن، قافیہ اور خیال بندی کی قیود سے نکالا اور شاعری میں حقیقی زندگی کی ترجمانی کو وسیلہ اظہار بنایا۔ انھوں نے نئے موضوعات کی مدد سے شاعری میں نئے انداز سے اظہار خیال کا شعور اجاگر کیا اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے نئی راہیں بنائیں۔ حالی کے بعد نئے آنے والوں نے وطن پرستی، قومی و سماجی شعور اور اصلاح معاشرت کی ترغیب دی۔ انھوں نے اظہار کے نئے سانچے اور نئی ہیئتیں تخلیق کیں۔ تشبیہ و استعارے اور اشارے کنائے کے نئے انداز مروج کر کے جدت افکار کو پروان چڑھایا۔[۲۷] پروفیسر گوپی چند نارنگ جدید اردو نظم کے بارے لکھتے ہیں:

''جدید نظم کی سب سے بڑی پہچان اس کا ارتکاز ہے، نیز ایجاز، اختصار، تہہ داری اور جامعیت۔''[۲۸]

اردو شاعری میں آزاد اور معریٰ نظم لکھنے والوں میں ن۔م۔راشد، تصدق حسین خالد اور میراجی کے نام سرفہرست ہیں جنھوں نے قدیم روایتی تصورات سے انحراف کر کے مغربی انفرادیت پسندی کی سوچ کو پروان چڑھایا۔ ن۔م۔راشد جدت پسندی کے سب سے بڑے علمبردار ہی جنھوں نے نئی علامتوں اور تمثیلی انداز سے نئی راہیں تراشی ہیں۔ ن۔م۔راشد اور میراجی سے سحاب قزلباش کی شناسائی آل انڈیا ریڈیو سروس سے تھی۔ بعد ازاں لندن میں قیام کے عرصے میں ادبی محفلوں میں شرکت کر کے سحاب ن۔م۔راشد کی شاعری سے محظوظ ہوتیں اور انھی کی طرز پر شاعری میں آزاد اور نثری نظمیں لکھیں۔

نظم نگاری کے حوالے سے شاعرہ نے نثری نظم کو اہمیت دی ہے ان کے شعری مجموعہ میں شامل پہلی دو نظمیں 'نئی زمین نیا آسمان بنانا ہے' اور 'ابھی تو' کے علاوہ باقی سب آزاد نظمیں ہیں۔ سحاب نے یہ دونوں نظمیں قیام پاکستان کے فوراً بعد ۱۹۴۷ء میں لکھی ہیں۔ جن میں وطن سے محبت اور اس کی روز افزوں ترقی کا صداقت پر مبنی جذبہ موجزن ہے۔ وطن کی آزادی کے ساتھ خوراک، لباس، رہائش کے علاوہ بیماریوں نے بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ادویات جیسی بنیادی ضروریات کی عدم دستیابی کی بنا پر بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا، تاریخ کی اتنی بڑی ہجرت میں مسلمانوں نے اپنے گھر بار چھوڑ کر ایک نئی سرزمین پر نئے سرے سے زندگی کی شروعات کی۔

سحاب نے اپنی شاعری کا آغاز وطن عزیز کی محبت سے سرشار جذبے کے زیر اثر کیا اور معاشرتی مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ان کی ابتدائی دونوں نظمیں ۱۹۴۷ء میں لکھی گئیں ہیں جن میں وطن عزیز کو دنیائے افق پر بہتر سے بہترین بنانے کا عزم مصمم ہے۔ شاعرہ کہتی ہیں ہمارے ہی دم سے اس وطن میں خوبصورتی اور نکھار ہے۔ مسلمان قائدین کے سچے جذبوں کی عکاس یہ نظم بلند آہنگ کے ساتھ اس وطن کے قیام کے لیے مسلمان جانوں کے نذرانے پیش کرنے کا اظہار کرتی ہے جنھوں نے اپنے گھر بار اور جائیدادوں کو قربان کر کے ایک علیحدہ اسلامی مملکت کے قیام کا خواب جو علامہ اقبال نے دیکھا تھا اسے پورا کیا قائد اعظم اور دیگر رہنماؤں کی معیت میں مسلمان شانہ بشانہ لڑے اور لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کر کے ان کے دلوں میں ایک الگ اسلامی و فلاحی مملکت کا تصور پیدا کر کے اس کے حصول کے لیے ایک پلیٹ فارم پر سب مسلمان کو اکٹھا کیا۔ قیام پاکستان کے حصول کے لیے مسلمان کو بے پناہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ مذہبی، لسانی اختلافات کی بنا پر ہندو اکثریت علاقوں میں مسلمانوں کو اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں اور ہندوؤں کی ہجرت تاریخ کی ایک بڑی ہجرت کہلاتی ہے۔ ہجرت کے ساتھ ہی پاکستان کو وسائل کی عدم دستیابی کی بنا پر دیگر بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا جن میں مہاجرین کی آبادکاری، خوراک، رہائش، لباس، ادویات جیسی بنیادی ضروریات تھیں۔ ہندوستان کی طرف سے وسائل کی غیر مساوی تقسیم کی بنا پر پاکستان کے حصے میں نہایت کم سامان آیا۔ سحاب ایک باشعور انسان تھیں اور حالات کا گہرا مطالعہ رکھتی تھیں۔ ان مسائل پر انھوں نے اپنے اشعار میں احسن انداز میں نشاندہی کی اور مسلمانوں کے عزم و حوصلے کو مزید بڑھانے کے عزم کے ساتھ ان مسائل سے نمٹنے کا عہد کیا:

پھر آج ظلم نے چھائی ہے چھاؤنی ہر سو

پھر آج در پے آزاد ہو رہا ہے عدو

نیا ستم ہے کہ گویا ستم کی حد ہی نہیں
نہ پہلی صبحیں نہ شامیں نہ آسمان و زمیں
اب اپنے جذب صداقت کو آزمانا ہے
نئی زمین نیا آسمان بنانا ہے [۲۹]

۱۹۴۷ء میں لکھی جانے والی دونوں نظمیں وطن کی محبت سے سرشار، اخوت و محبت کا درس دیتی، تمام مسلمانوں کو ایک پرچم کے سائے تلے متحد کرنے کا عزم لیے ہوئے ہیں۔ وطن عزیز کے حصول کے بعد وہ مسلمان جو دیگر وجوہات کی بنا پر اپنی سرزمین پر آکر مقیم نہ ہو پائے اور دیار غیر میں بے اماں ہو کر ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں تکالیف برداشت کر رہے ہیں۔ ان سب بچھڑے ہوؤں کو اپنے وطن لے کر آنا ہے۔ سحاب نے وطن کے لیے چمن اور گلشن کے استعارے استعمال کیے ہیں۔ نہایت خوبصورت انداز سے چمن سے گلشن تک کا تاثر انھوں نے واضح کیا ہے۔ پھلواری سے لے کر ایک مکمل باغ بننے تک کا اشارہ دیا ہے۔ ایک ایسا باغ جہاں تمام پیچھے رہ جانے والے لوگوں کو واپس لا کر اسے مکمل باغ بنا کر اور اس کی خوبصورتی اور دلکشی میں اضافہ کرنا ہے اور دنیا کے افق پر اسے بہترین باغ بنانا ہے۔

ہمیں تو اس چمن کو گلشن عالم بنانا ہے
ابھی بچھڑے ہوؤں کو ایک ہی مرکز پہ لانا ہے [۳۰]

جانبازی اور سرفروشی کے جذبے سے سرشار وطن کے ہر ایک فرد میں شعور و آگہی پیدا کر کے ان سب کو اس وطن کا امین بنانا ہے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری سونپنی ہے۔

ابھی سوتے ہوؤں کو دولت بیدار دینی ہے
ابھی تو قوم کے ہر فرد کو تلوار دینی ہے [۳۱]

اردو نظم کا کینوس بہت وسیع ہے اس میں مختلف مضامین باآسانی جگہ پا سکتے ہیں۔ نظم میں پابند، آزاد، معری، نثری نظم اور طویل نظموں نے نئے آہنگ اور ہیئتوں سے روشناس کروایا۔ نظم میں وسعت مضامین کے حوالے سے شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں۔

''نظم کی سب سے بڑی قوت اس کی(Plasticity پلاسٹک پن) ہے کہ اسے توڑ موڑ کر جس طرح بنائیں، لیکن وہ نظم ہی رہتی ہے نظم میں تجربے، تنوع اور کثرت معنی کے امکانات تقریباً لا متناہی ہیں۔''[۳۲]

سحاب قزلباش نے نظموں میں روایت کی بجائے جدت کو ترجیح دی اور عورت کے مسائل، خواہشات اور ضروریات کو بطور خاص شاعری کا موضوع بنایا۔ اس سے قبل کشور ناہید، پروین شاکر اور فہمیدہ ریاض نے عورت کے تشخص کو اجاگر کر کے زندگی کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔ عورتوں کی شاعری کے موضوعات کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''پاکستانی شاعرات کا خاص موضوع عورت، جسم و جاں، تشخص، ذات و صفات اور اپنے ہونے کا احساس کرانا ہے۔ عورت کی تصویر کشی میں شاعرات نے انداز و اسلوب بدل بدل کر پر معنی شاعری کی ہے۔''[۳۳]

سحاب نے اپنے کلام میں روایت اور عصری رجحان دونوں کو جگہ دی۔ غزلوں میں خاص روایتی انداز نظر آتا ہے نظموں میں ابتدائی کلام روایتی انداز میں لکھا گیا۔ بعد ازاں ترقی پسند تحریک کے اثرات قبول کرتے ہوئے روایت سے انحراف کر کے آزاد نظم میں ایک نئے انداز سے جلوہ گر ہوئیں، پرانی پوشاک کو اتار پھینک کر جدید زمانے کی جدت پسند سوچ کی عکاس نظر آتی ہیں لیکن بے اعتنائی، بے اعتباری اور تنہائی کی صعوبت لیے اب بھی بے اماں اور رشتوں کے حصار کی متلاشی ہیں۔

نظم 'اخبار بیچنے والی بڑھیا' میں یورپ و برطانیہ کی تیز گام زندگی کی عکاسی کی گئی ہے جہاں انسان دن رات کام میں مصروف دنیا و مافیہا کا خاموشی سے تجزیہ کرتے اپنی اصل منزل کی طرف رواں دواں آگے بڑھتے ہیں۔ مغربی ممالک میں فرد واحد اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ عمر کے جس حصے میں بھی ہو ذمہ داریاں بانٹنے اور دوسروں کا سہارا بننے کا تصور نہیں ہوتا بلکہ بچے نوجوان اور بوڑھے سب اپنی کفالت کے خود ذمہ دار ہوتے ہیں۔

مغربی ممالک میں انسان زندگی بھر جدوجہد میں مگن رہتا ہے اور اپنی زندگی کی تمام ذمہ داریوں کو احسن انداز سے نبھاتا ہے۔ مغربی معاشرے میں فرد واحد اپنی کفالت کا ذمہ دار خود ہے۔ وہاں انسانی زندگی مشینی پہیے کی مانند تیز رفتاری سے چلتی ہوئی وقت کے ضیاع کی قائل نہیں۔ عمر کے ہر حصے میں احساس ذمہ داری اسی طرح موجود رہتا ہے بچے، بوڑھے، جوان سب کے لیے یکساں معیار زندگی رائج ہے۔

نظم 'آج کی نسلوں کا یہ وقت رگ جاں ہے' موجودہ دور کے بدلتے تناظر کی عکاسی لیے معاشرتی اقدار کے تیزی سے بدلتے رجحانات پر طنز ہے۔ گزشتہ کل کی روداد اب بے معنی اور وقت کا ضیاع ہے اب ہر کام کو آج اور ابھی پایہ تکمیل

تک پہنچانے کی سعی میں سر گرداں ہے ہر شخص۔ آج کی محبت محبوب کے سراپے، لباس، بناؤ سنگھار اور چوڑیوں کی کھنک میں پنہاں نہیں۔ بلکہ بدلتی دنیا کے بدلتے رجحانات کے سبب یہ سب ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ آج کے عاشق کا معیار خوب سے خوب تر کا خواہاں نظر آتا ہے۔ شاعرہ مغربی معاشرے کی غیر اخلاقی اقدار اور مادر پدر آزادی پر طنز کرتی ہیں۔ معاشرتی اقدار کے اس بدلتے معیار پر آج کی عورت یوں باور کراتی ہیں۔

تیل نو من جو ہو تو پھر ناچو
اے بہن آج کی زندگی میں فردا نہیں
چوڑیوں جھانجنوں میں حربہ نہیں
میرا ہم رقص بھی منٹوں میں چکا دیتا ہے
اب نہ فردا کی محبت میں کوئی جیتا ہے
اب تو بس جانِ جہاں ایسا ہے
تو نہیں اور سہی۔۔ اور نہیں۔۔ تو ہی سہی [۳۴]

نظم تین بند پر مشتمل ہے شاعرہ نے یہ نظم لندن میں ۱۹۶۹ء میں لکھی اور وہاں کی بے راہ روزندگی کی عکاسی اس نظم کے تیسرے بند میں یوں کرتی ہیں جہاں مذہبی اقدار سے انحراف نے اخلاقی پستی کے سر عام نظارے پیش کر دیے ہیں۔ معاشرتی اقدار کے اس بگاڑ سے مادیت پرستی نے گہری جڑیں بنالی ہیں جو معاشرے میں ناسور کی مانند پھیلتا چلا جارہا ہے۔ سحاب مشرقی تہذیب و تمدن سے محبت کرنے والی خاتون ہیں مادر پدر آزادی اور مذہبی اقدار سے انحراف انھیں شدت سے محسوس ہوتے ہیں۔ شاعرہ ارد گرد کے ماحول کے اثرات کو محسوس کر کے اپنے تاثرات کا اظہار کرتی ہیں۔ وہ لندن کی آزاد زندگی کو محسوس کرتی ہیں اور اپنی نظموں میں ان کی تماثیل پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے مٹتی ہوئی اقدار پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔

ان سمٹتے ہوئے لمحوں میں تو سیجوں کا تعین بھی نہیں
سیڑھیوں پہ، گلی کوچوں میں، خیابانوں میں

سچ ہی سچ ہر ایک جاپہ ابھر آتی ہے

تیرے احساس کی تیزی میں فقط گرمی دل شامل ہو

ورنہ بٹوے میں فقط سلور ہو!

کیوں کہ

یہ وقت رگِ جاں ہے میری نسلوں کا [۳۵]

یہ نظم لمحہ فکریہ ہے ان عناصر پر جنھوں نے شخصی آزادی کا نام دے کر معاشرے میں ناسور بھر دیا ہے اور آئندہ نسلوں کو اس زہر ہلاہل کی ترغیب کھلے عام مل رہی ہے۔ اس نظم میں عورت کی حیثیت ایک محبوب کی نہیں جس کی سادگی و وقار سے عاشق کا دل بے قرار ہو بلکہ آج کی محبت میں جنسی احساس کی کشش ہے۔

نظم 'دو چہرے۔۔۔ دو اجنبی جسم' عشق و محبت کی ان امر داستانوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جہاں محبوب کا ایک خاص تصور پایا جاتا تھا۔ اخلاص و محبت سے گندھے ان رشتوں کی جگہ رفتار زمانہ کی مادی آسائشوں نے اب اپنی جگہ بنالی ہے۔

سحاب معاشرے کے اس بدلتے رجحان کے خلاف طنز کرتی ہیں جہاں مغربی معاشرے میں اور آج کے بدلتے تناظر میں عشق و محبت کا معیار محبوب کی خوبصورتی، دلکشی یا صنف مخالف کی خاص کشش کا نام نہیں بلکہ آج کی محبت کا انحصار مال و دولت اور اسٹیٹس ہے۔ مرد اور عورت دونوں کے ہاں معیار اور ترجیحات نے نئے رخ لیے ہیں۔ اب بے لوث محبت کے جذبے کی جگہ مادیت پرستی نے فوقیت حاصل کر لی ہے۔

نظم 'دو چہرے۔۔۔ دو اجنبی جسم' دور حاضر کی بدلتی اقدار پر روشنی ڈالتی ہے۔ آج کی محبت کا معیار ظاہری شخصیت اور روپیہ پیسہ ہی ہے۔ بے لوث محبت کا زمانہ گزر گیا ہے۔ وہ پرانی محبت کی داستانیں جو تاریخ میں امر ہو گئیں اب ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس نظم میں لڑکے اور لڑکی دونوں کی ترجیحات کو بیان کیا گیا ہے۔ اب امر محبت کی جگہ وقتی خوشی اور پیسے نے جگہ لے لی ہے۔ نظم میں لڑکا اور لڑکی دونوں ہی ظاہری چیزوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ لمحاتی خوشی کے آرزومند ہیں۔ زندگی بھر کی رفاقت کی تمنا اب قصہ پارینہ ہو چکی ہے۔

نظم 'محبوب کی ماں کے نام' ساس اور بہو کے فطری رقابتی عنصر کی عکاسی ہے۔ تمثیلی انداز میں منظر بیان کیا گیا ہے۔ جذبہ رقابت کی ایک خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔ اور رقابت کے انجام میں خالی ہاتھ رہ جانے پر دکھ اور پچھتاوے کا احساس بھی پایا جاتا ہے۔

تو اور میں
دونوں ہی سوالی
میں نے اپنے خون سے بھر لی مانگ، ترا کیا چھینا ہے
دیکھ مری آنکھوں کے چمکتے سارے تارے ٹوٹ گئے
پھول کھلے رخساروں پہ اُبٹن کی زردی چھوڑ گئے
ایسے ہی چپ چاپ نہ جا
سنتی جا [۳۶]

نظم 'عورت کے تین روپ' (اپنی ایک شاعرہ دوست کی نذر) شاعرہ نے اپنی دوست شاعرہ کو مخاطب کیا ہے۔ قرین قیاس ہے کہ یہ نظم شاعرہ نے فہمیدہ ریاض کے بارے میں لکھی ہے۔ کیونکہ وہ سگریٹ بھی پیتی ہیں۔ اس نظم میں انھوں نے استفہامیہ انداز میں کمرے میں موجود بکھری اشیاء کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ ان اشیاء کے جان بوجھ کر چھوڑ جانے پر شاعرہ نے حیرت کا اظہار کیا ہے اور اس کے پیچھے چھپی وجوہات کو تلاشنے کی کوشش کی ہے۔ شاعرہ نے اپنی دوست کے گہرے راز کو عیاں کیا ہے۔

نظم میں عورت کے تین روپ۔ محبوبہ، دوست اور سوکن کے ہیں۔ محبوبہ کی بکھری چیزیں اس کی جان بوجھ کر چھوڑ جانے کی وضاحت کرتی ہیں۔ سحاب کی شاعری میں معاشرتی رویوں کی عکاسی پائی جاتی ہے اور چوری چھپے رشتے استوار کرنے پر ملامت کا اظہار بھی موجود ہے۔

اور میرے دل میں اک اور تیری ہی جیسی
چپ چاپ سی۔۔۔۔۔
دونوں ہاتھ میں دل کے چراغ لیے آ بیٹھی ہے
روشن لو میں۔۔۔۔اس کے چاک گریباں نیچے
دو ننھے سر۔۔۔۔اس کے بچے
شکووں کی صلیب پہ لٹکے ہیں

ان سب کی آنکھیں پوچھ رہی ہیں مجھ سے
اور وہ چپ چاپ کھڑی، اُس کی بیوی
ان دونوں کے پیچھے سے مجھ کو گھور رہی ہے [۳۷]

نظم 'سوکن سے' میں سوکن سے ملاقات پر خوشی اور راحت کا احساس ہے۔ سوکن کے چہرے پر خوشی اور مسرت کا سماں دیکھ کر بے حد خوشی کا اظہار کیا ہے۔ محبوب کی عادت کے پیش نظر اس کی معصوم اور بے لوث جذبوں کی حدت محسوس کر کے دل میں سوچتی ہیں کہ ایسی رفاقت کا احساس ماضی میں کبھی اس کے لیے بھی خوش کن تھا لیکن وقت کے ساتھ اس کی اہمیت ختم ہو گئی۔ اب وہ جس طرح محبوب کی بے وفائی کو سہتی اور اس وقت کو ترستی ہے سوکن بھی اس طرح ترسے گی اور آنسو بہائے گی۔

نظم 'دو ننھی لڑکیاں' نو عمری کے خوابوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جاگتی آنکھوں دیکھے جانے والے خوابوں کی حیثیت نہیں ہوتی ان خوابوں میں باغوں اور پریوں کا بسیرا ضرور ہوتا ہے لیکن حقیقی زندگی میں ان کو تلاشنا مشکل امر ہے

نظم 'دو ننھی لڑکیاں' میں لڑکیوں کی عمومی فطرت کا بیاں ہے۔ لڑکیوں کے خواب عموماً حقیقت سے دور اور خوش گمانی پر مبنی ہوتے ہیں۔ نظم میں دو ننھی لڑکیاں الف لیلوی داستان کی طرح پرستان کے خواب دیکھا کرتی ہیں جہاں ان کی ہمجولی پریاں ہوتی ہیں۔ ان خوابوں کو تراشتے تراشتے عموماً حقیقت پسندی کی دیوار پھلانگ جاتی ہیں۔ خوابوں کی دنیا میں کھوئے ہوئے وہ ارد گرد سے غافل اپنی دنیا میں مگن رہتی ہیں۔ ننھی لڑکی اپنے خوابوں کا ذکر کرتے ہوئے کائی پاؤں سے کریدتی جاتی ہے شاعرہ نے کائی، خرگوش اور پریوں جیسی علامتوں سے ایک مخصوص فضا تخلیق کی ہے۔

مرے باغ کے پھول میں خوشبو ہی خوشبو ہوتی تھی
مرے باغ میں پریاں ناچا کرتی تھیں
چاند ستارے ان کی آنکھوں میں ناچا کرتے تھے
جوتے کی دیوار سے دیوار کی کاہی گر رہی تھی
کالے مٹیالے ہرے رنگ کے دھبے
اُبھر رہے تھے
خرگوش کی دو آنکھوں نے گھورتے ہوئے کہا
اے مری نئی پڑوسن
اب ان دھبوں کو کیسے مٹاؤ گی [۳۸]

نظم 'اے میرے ضدی ہٹیلے بچو' دو جوشیلے نوجوانوں کی ہٹ دھرمی اور ضد کے واقعے پر مبنی ہے جس نے ان جوانوں سے ان کی زندگی چھین لی۔ یہ نظم بی بی سی لندن کے قریب خوف وہراس پھیلانے والے دو نوجوانوں کے بارے میں لکھی گئی ہے جنھوں نے نقلی پستول اٹھائے ہوئے تھے۔ پولیس نے ان پستولوں کو اصل جان کر انھیں موت کا نشانہ بنایا۔

نظم 'ماں کا تحفہ' ماں کی بیٹے سے محبت کا اظہار ہے۔ ماں کا تحفہ میں شاعرہ نے بیٹے کی چوتھی سالگرہ کے موقع پر اس کی خوشگوار اور بکھری یادوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ بیٹا اپنی ماں سے دور باپ کے پاس پڑھنے کی غرض سے چلا گیا ہے اور پیچھے بے قرار ماں اس کی یادوں کو کے سہارے وقت گزارتی ہے۔ اپنے بیٹے کی شرارتیں، قہقہے، کھلونے سب باری باری یاد آتے ہیں۔ بیٹے کی ہنسی سے پورا گھر روشن نظر آتا تھا جب کہ اب اس کی غیر موجودگی میں دنیا کی تمام رنگ ورعنائی اور خوبصورتی ہونے کے باوجود بھی ماں کی مامتا کے لیے تمام رعنائی اسے بے وقعت اور پھیکی محسوس ہوتی ہے ماں بچے کی یادوں کو زندگی کا حاصل کل سمجھتی ہے اور اس خوف میں مبتلا ہے کہ کہیں یہ خوبصورت یادیں بھی اس سے چھن نہ جائیں۔

'لینڈ لیڈی' ۱۷ صفحات پر مشتمل طویل آزاد نظم ہے۔ نظم میں لینڈ لیڈی اپنے گھر کا ایک کمرہ کرائے پر دیتی ہے جو اس کی معاش کا ذریعہ ہے اور اس سے اس کے گھر کا راشن چلتا ہے۔ نظم تین موضوعات پر مبنی ایک دوسرے سے مربوط انداز میں بیان کی گئی ہے پہلے حصے میں حضرت عیسیٰؑ کی صلیب پر لگی تصویر پر اللہ تعالیٰ سے ان کی راہ حق پر ملنے والی صعوبتوں پر استفسار کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو حق پر ہونے پر صعوبت کا سامنا کیوں کر کرنا پڑا؟

حضرت عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے دنیا سے شر اور دجال جیسے فتنے کے خاتمے کے لیے دنیا سے اٹھا لیا۔ قرآن پاک کے مطابق حضرت عیسیٰؑ دوبارہ اس دنیا میں واپس تشریف لائیں گے اور دجال کو شکست دے کر دنیا میں اسلام کا بول بالا کریں گے۔ عیسائیت کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کو ان کے مخالفین نے زنجیروں میں باندھ کر صلیب پر لٹکا دیا تھا اور وہیں ان کی روح پرواز کر گئی۔

'لینڈ لیڈی' اپنے اندر کہانی ضم کیے طویل نظمیہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ نظم کا دوسرا موضوع خیالات اور لطیف احساسات کی سرشاری ہے جہاں چند لمحوں کے لیے خوشی کا اہتمام ہے۔ عورت لطیف جذبوں کو محسوس کرتی ہے لیکن اس کے باطن میں چھپی عورت فوراً سامنے آکر اسے جھنجھوڑ کر حال میں لا کھڑا کرتی ہے اور اسے محض ایک لینڈ لیڈی کی حیثیت یاد دلاتی ہے۔

جب کسی راہ کا آغاز ہوا یہ پہنچی
بن بلائے ہوئے مہماں کی طرح
کیسے تیور سے اُگلواتی ہے
بن کہی بات وہ آنکھوں سے سنا جاتی ہے
چین پاجاؤں تو۔۔۔ جل جاتی ہے
طوق۔۔ تنقید کے چپکے سے پہنا جاتی ہے
بیاہتا تم ہو فقط، مجھ کو بتا جاتی ہے [۳۹]

لینڈ لیڈی کے ہاں رہنے والوں میں مختلف مکتبہ فکر کے لوگ ہیں ان میں سے ایک شخص کتابوں کا رسیا جس کا کل وقتی شغل کتابوں کا مطالعہ کرنا تھا۔ ہر بار وہ شخص نئی کتب لے کر آتا اور مطالعہ میں مشغول رہتا۔ اسے مشرق کی تہذیب کا عکس لینڈ لیڈی کی شخصیت میں نظر آتا ہے اور اسی مشرقی تقدس اور وقار کا احترام کر کے وہ اجنبی مشرقی تہذیب کا گھرویدہ ہو جاتا ہے۔

اس کے نرم و شیریں لہجے میں شکریہ کے کلمات لینڈ لیڈی کے دل میں گھر کر جاتے ہیں اس کے الفاظ کی بازگشت کے سحر سے خود کو چھڑانے کے لیے لینڈ لیڈی اب کی بار خاندان کو کرایہ پر رکھنے کا فیصلہ کرتی ہے۔

لینڈ لیڈی تنہائی کا دکھ سہتی ہے اس کی مصروفیت کا مرکز گھر کے ایک حصے کو کرایہ داروں کے لیے وقف کر کے ان کے قیام و طعام کا انتظام کرنا ہے۔

سحاب قزلباش: شعری اسلوب

سحاب کی غزلیں روایتی انداز پر مبنی ہیں جن میں ردیف و قافیہ کا خاص اہتمام کیا گیا ہے ان کے ہاں غزلوں کے موضوعات محبوب کی بے وفائی اور نارسائی لیے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جدت انداز کو اپنایا اور پرانی روش پر چلنے کی بجائے نئی تشبیہات و استعارات سے شاعری کو معنویت بخشی ہے۔ ان کی شاعری کا موضوع عشق مجازی ہے۔ سحاب قزلباش مشاعروں میں اپنا کلام پیش کرتی تھیں۔ احسان دانش ان کی غزلوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''سحاب قزلباش جناب آغا شاعر قزلباش دہلوی کی صاحب زادی ہیں۔ میں نے ان سے مشاعروں میں جس قدر غزلیں سنی ہیں ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا کلام معمولی دل و دماغ کی کاوش نہیں وہ جس

توجہ سے کہتی ہیں اسی ذوق و شوق سے پڑھتی بھی ہیں۔ ان کے اشعار میں رنگینی بھی ہے اور دلکشی بھی، غنائیت بھی ہے اور سلاست بھی۔"[۴۰]

سحاب نے ڈوبتے ہوئے سورج کے منظر سے زندگی کا استعارہ لیا ہے۔ استفہامیہ انداز میں سورج کے ڈوبنے کو یوں بیان کرتی ہیں۔

غروب مہر پر کس نے لہو چڑھایا ہے
یہ کس نے خون جلایا ہے روشنی کے لیے [۴۱]

شاعرہ واشگاف الفاظ میں جبر کے خلاف باآواز بلند احتجاج کرتی ہیں۔

ہمارے پھول، ہمارا چمن، ہماری بہار
ہمیں کو جا نہیں ملتی ہے آشیانے کو [۴۲]

شاعرہ وطن کو چمن سے موسوم کرتی ہیں۔ وطن کے لوگ پھول اور ان کی خوشیاں بہار کی مانند ہیں۔ وطن کا چپہ چپہ خود سے بڑھ کر عزیز ہے لیکن اس خلوص اور محبت کے باوجود وہاں اس چمن میں آشیانے بنانے کے لیے جگہ میسر نہیں۔

انسان تنہا زندگی نہیں گزار سکتا رشتوں ناتوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم رہتی ہے۔ خونی رشتوں کے علاوہ دوستی کا رشتہ زندگی میں جزو لاینفک کی مانند ہے لیکن مخلص دوست ملنا بھی کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔ انسان نے جب کبھی شکست کھائی ہے عموماً اپنے رفقاء خاص کے دغا دینے پر کھائی ہے۔ شاعری میں بیشتر شعرا نے دوست کی رقابت کا بارہا بار تذکرہ کیا ہے۔ غالب نے بھی شاعری میں دوست کے ناصح ہونے کا تذکرہ چھیڑا۔ شاعرہ دوستی کے لبادے میں چھپی دشمنی کو طنزیہ انداز میں یوں بیان کرتی ہیں۔

دوست سے بڑھ کر نبھائے گا کوئی کیا دشمنی
قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری [۴۳]

سحاب فارسی زبان پر مکمل عبور رکھتی تھیں ایران میں ملازمت کے دوران انھیں فارسی زبان پر مزید عبور حاصل ہو گیا۔ اس شعر میں انھوں نے فارسی محاورے کا بخوبی استعمال کیا ہے جس کا مطلب اہل کمال کی قدر کمال والے ہی جانتے ہیں۔[۴۴] اردو شاعری کے آغاز میں فارسی زبان کا گہرا اثر رہا۔ شعرا کرام اردو کے ساتھ فارسی زبان کا برمحل استعمال کر لیتے۔

بعض اوقات ایک مصرع اردو کا اور دوسرا فارسی کا ہوتا۔ شاعرہ نے بھی اسی طرز پر لکھا۔ شاعرہ خود غرض اور مطلبی رشتوں پر طنزیہ انداز میں دوستی کے لبادے میں چھپی دشمنی کا تذکرہ کرتی ہیں۔

سحاب نے کم عمری میں شاعری کا آغاز کیا۔ انھوں نے مشاعروں میں بھی اپنا کلام پڑھ کر سنایا۔ ان کی پڑھی گئی غزل کا مقبول عام شعر جس نے نہایت کم عمری میں ہی اسے شہرت سے سرفراز کیا اور آج بھی زبان زد عام ہے جس میں دل جلا کے روشنی مہیا کرنے کی تحریک پیدا کی ہے۔ اسے افسر الشعرا بلکہ اس سے بڑھ کر کتاب الشعرا کہہ سکتے ہیں کیونکہ آج بھی سحاب کے ذکر کے ساتھ ان کا یہ شعر سننے کو ضرور ملتا ہے۔ اس میں دلوں کو روشنی سے منور کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ انسان اپنی اقدار کو چھوڑ کر دنیاوی کاموں میں مشغول و مصروف ہو چکا ہے۔ مذہب اور مذہبی اقدار سے ایک ثانوی حیثیت کا واسطہ رہ گیا ہے۔ دلوں میں محبت اور تڑپ کا فقدان ہے ایسے حالات میں دیر و حرم کا نام لینے والوں کی تعداد میں بتدریج کمی آ رہی ہے۔ یہ لمحہ فکریہ ہے ایسے حالات میں دلوں میں حرارت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

سحاب نے یہ شعر قیام پاکستان سے قبل ایک اجلاس میں پڑھا تھا جس میں تحریک پاکستان کی ذی قدر شخصیات نے شرکت کی تھی۔ قیام پاکستان کے حوالے سے یہ شعر نہایت موزوں خیال کی ترجمانی لیے ہزاروں دلوں کی زبان بن گیا۔[۴۵] شعر یوں ہے۔

بجھ رہے ہیں چراغ دیر و حرم
دل جلاؤ کہ روشنی کم ہے [۴۶]

شاعرہ نے دیر و حرم کا استعارہ متعدد اشعار میں استعمال کیا ہے ان کا ایک شعر جو مقبول عام رہا اس کے علاوہ دیگر شعروں میں بھی اس کا استعمال کیا گیا ہے۔

دیر و کعبہ میں جی نہیں لگتا
دل سلامت ہزار ویرانے [۴۷]

اسی طرح

جہاں میں دیر و حرم کے وطن تو دیکھ لیے
مگر کہیں ترے انساں کا بھی ہے کوئی وطن [۴۸]

شاعرہ لفظوں کی تکرار سے موسیقی کا جادو بکھیرتی ہیں۔ دلی کیفیات کی ترجمانی کے لیے ہمیشہ الفاظ کا سہارا نہیں لیناپڑتا بلکہ محسوسات کے ذریعے دل کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ لکھتی ہیں۔

دل پہ کوئی چوٹ لگ جائے تو دل آواز دے

تم ابھی واقف نہیں ، ہوتی ہے کیا دل کی لگی [۴۹]

سحاب نے اپنے کلام میں تراکیب سازی سے بھی کام لیا ہے اور تراکیب کی مدد سے تصویر کشی کر کے ایک خاص شعری جاذبیت پیدا کی۔ ان کے ہاں ایک ہی تراکیب کثرت استعمال کے باوجود ہر بار نئی معنویت اور سوچ کا ایک نیا زاویہ پیش کرتی ہے مثلاً دیر و حرم، جامِ جم، خاک تپاں۔ سحاب نے ندائے دوست اور سوزدروں جیسی تراکیب بھی استعمال کی ہیں۔ اردو شاعری میں تراکیب سازی کا رجحان فارسی زبان سے مروج ہوا۔ ہر طبقہ کے شاعر نے اپنی دانست کے مطابق تراکیب کو شاعری میں جگہ دی۔ صفحہ اول کے شعرا نے اپنی بصیرت اور خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر فرسودہ تراکیب کو ایک نئے انداز سے جذبات واحساسات اور مشاہدات و تجربات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ تراکیب کا بر محل استعمال وسعت نظر کا غماز ہوتا ہے۔ شاعری میں موزوں الفاظ کا استعمال بہترین شعر کی تخلیق کے لیے لازم ہے۔ شاعرہ دل کو جامِ جم سے تشبیہ دیتی ہیں

حقارت سے نہ دیکھ دل کو جام جم بھی کہتے ہیں

اسی خاک تپاں کو فاتح عالم بھی کہتے ہیں [۵۰]

ڈاکٹر اکبر حسین قریشی لکھتے ہیں:

> ''ایشیائی لوگوں کا خیال ہے کہ جام جم سے تمام عالم کا حال معلوم ہو جایا کرتا تھا۔ صحیح اتنا ہے کہ اس میں خطوط کھدے ہوئے تھے اور ان خطوط کی مدد سے حساب لگا کر ستاروں کی گردش اور ان کا حال معلوم ہو جایا کرتا تھا۔''[۵۱]

شاعرہ نے دل کی کیفیات کی ترجمانی کے لیے جام جم، خاک تپاں اور فاتح عالم جیسے الفاظ کی معنویت سے شعر میں جان ڈال دی ہے۔ دل کی مضطرب کیفیات کی عکاسی الفاظ کی بجائے نگاہوں سے ہوتی ہے خوشی و مسرت کے لمحات میں آنکھوں میں پیدا ہونے والی چمک، تکلیف و پریشانی میں اضطراب کی کیفیت اور آنکھوں سے آنسوؤں کا بہنا یہ سب دل کا اصل حال بتا دیتے ہیں۔ اسی اضطراب کی کیفیت کے لیے آنسو، موتی اور شبنم سے تشبیہیں دی جاتی ہیں۔

شاعرہ نے اپنے کلام میں عورت کی بے بسی اور محکومی کے خلاف آواز اٹھائی۔اس غزل میں انھوں نے مرد کی بالادستی اور حکمرانی کی روش پر لب کشائی کی ہے۔ عورت بااختیار ہو کر بھی مرد کی محکوم ہے اور یہ مرد اس کا جیون ساتھی اور رفیق کار تبہ رکھتا ہے۔ لیکن عورت کی ذرہ سی کوتاہی اسے برداشت نہیں ہوتی اور ہمسری پر اسے بے توقیر کر کے گھر کی چھت تک چھین لینے سے عار محسوس نہیں کرتا۔ گھر سی جنت کے بارے شاعرہ نے ایک خوبصورت شعر میں یوں اظہار حضور خیال کیا ہے۔

زمانہ کہہ رہا ہے تم نے گلشن ہی مٹا ڈالا

مروت برطرف لو آج ایسا ہم بھی کہتے ہیں [۵۲]

انسانی دل کی کیفیت کبھی ایک سی نہیں رہتی اس میں خوشی اور غم دونوں کا گزر رہتا ہے۔ انسان کی زندگی جمود کا نام نہیں بلکہ معاشرتی، معاشی حوالوں سے تغیر انسانی زندگی کا خاصا رہا ہے۔ کبھی دھوپ اور کبھی چھاؤں کی اسی کیفیت کو شاعرہ نے جنت اور جہنم سے تعبیر کیا ہے۔ سادہ اسلوب میں لکھا گیا یہ شعر صنعت تضاد کی خوبی سے مزین انسان کی فطرت کا بہترین عکاس ہے:

آدمی اک تضاد باہم ہے

کبھی جنّت کبھی جہنم ہے [۵۳]

انسان کی فطرت ایک سی نہیں ہوتی۔ ہر انسان دوسرے سے مختلف مزاج اور عادات کا مالک ہوتا ہے۔ شاعرہ نے سادگی سے انسانی شخصیت کے امتزاج کو بیان کیا ہے۔

غزل بنیادی طور پر ہجر و فراق اور مجبوری، بے بسی کے اظہار کا ذریعہ رہی ہے غزل کا ہر شعر اپنے اندر ایک مکمل سمندر رکھتا ہے۔ ایک مکمل کہانی لیے غزل کا ہر شعر دوسرے سے جدا اور مختلف مفہوم و معانی کا ذخیرہ لیے ایک الگ واقعے کی احوال پر مبنی ہوتا ہے۔ انسانی زندگی تغیر و تبدیل کا مجموعہ ہے ہر لمحہ پیش آنے والے نئے واقعات کا سامنا رہتا ہے۔ زندگی میں تند و تیز ہواؤں کا سامان کرنا پڑتا ہے اسی حقیقت کو شاعرہ نے آبشار اور برگ سے تشبیہ دی ہے۔ یہ دنیا کا کارواں آبشار کی مانند ہر لمحہ سرعت سے رواں دواں آوارہ برگ کو اپنے تھپیڑوں میں نامعلوم راہ سے انجانی منزلوں تک روشناس کراتا ہے۔

برگ آوارہ کی ترکیب متعدد بار شاعری میں پڑھی جا چکی ہے۔ شاعرہ نے زندگی کو برگ آوارہ سے تشبیہ دے کر لامکاں کا تاثر پیش کیا ہے:

اک آبشار پہ مانندِ برگِ آوارہ
کوئی مقام ہے اپنا نہ کوئی منزل ہے [۵۴]

دوست کی بے وفائی کا شکوہ شاعرہ نے متعدد اشعار میں کیا ہے۔ شاعرہ ارد گرد بکھری حقیقتوں کی کہانی رقم کرتی ہیں۔ ان کا شعر ملاحظہ ہے۔

دوست بن کر نہ دشمنی کرتے
بے وفائی تو کچھ کمال نہیں [۵۵]

دوستی جب بھی پرکھنے کی حدوں تک پہنچی
پڑ گئی ترک تعلق کی وہیں سے بنیاد [۵۶]

ان کے نزدیک محض مقصد پانے کی حد تک لوگ دوستی نبھاتے ہیں۔ دوستی میں جب بھی آزمانے کی حد آجائے تو اس روز رشتے کی بقاء نہیں رہتی۔ اسے یوں بھی لکھتی ہیں:

دوستی ہے تعلق مقصد
ہم نہ سمجھے یہ اک زمانے تک [۵۷]

شکستگی دل زندگی کی حقیقتوں سے آشکار کرتی ہے۔ خوشی اور غم کا امتزاج ہی زندگی کا اصل رخ ہے۔ غم سے آشنا ہو کر زندگی کی اصل خوشی کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ شاعرہ باور کراتی ہیں کہ اگر درد غم سے دل آشکار نہ ہوتا تو یہ نوحہ میری زباں سے کبھی بیاں نہ ہو سکتا۔ دنیا نے ہمیں بہت تکالیف پہنچائی ہیں۔ شاعرہ نے دنیا کی تکالیف اور مصیبتوں کے لیے تاب خورشید کا استعارہ استعمال کیا ہے اور اس کے مقابلے میں اپنے دل کو شبنم کہا ہے۔ سورج کی حدت یعنی دنیا کے غم و آلام نے اس کے نرم و نازک دل کو جو کہ شبنم کے قطرے کی مانند صاف شفاف اور صبح کی پاک فضا کی مانند تھا اسے چھلنی کر دیا ہے۔

دل پہ گر چوٹ نہ لگتی تو یہ عشرت تھا نہ غم
ساز کے پردے سے باہر نہ نکلتا سرگم

ہم کو بخشا ہے زمانے نے جہاں بھر کا اَلم
تاب خورشید سے چھلنی ہوا قلب شبنم [۵۸]

چمن کی خوبصورتی اور رعنائی کے لیے شاعرہ نے خوبصورت انداز میں پھولوں کی قربانی کو خراج پیش کیا ہے کہ جن کے دم سے چمن میں رونق بہار کا سماں پیدا ہوا ہے۔ اس میں موسم بہار اور باغباں کی کاوشوں کا چنداں اثر نہیں ہے بلکہ پھولوں نے اپنے خون سے اس باغ کی رونق میں چار چاند لگا دیئے ہیں اور ان کے دم سے ہی چمن بن سکا ہے۔

محبت محبوب کے لیے جنت اور جہنم دونوں کا سنگم ہے۔ محبوب کا دیدار نصیب ہو جائے اور خوش اسلوبی سے پیش آجائے تو عاشق کے لیے یہ لمحات کسی جنت سے کم نہیں ہوتے اور اگر محبوب کی بے اعتنائی اور اور بے رخی کا سامنا ہو تو ایسے لمحات جہنم سے زیادہ اذیت ناک اور دلگرفتی لیے ہوتے ہیں۔ شاعرہ نے اس شعر میں احسن انداز میں صنعت تضاد کا استعمال کیا ہے۔ جنت، جہنم، فنزوں اور کم جیسے الفاظ سے شعر کا حسن دوبالا کر دیا ہے۔

باہم وہ ایک تضاد محبت کہیں جسے
جنت سے ہے فنزوں تو جہنم سے کم نہیں [۵۹]

اسی طرح دلی کیفیت کی عکاسی یوں کرتی ہیں:

آنکھ تر ہے، خشک لب، دل چور ہے
کیا محبت کا یہی دستور ہے [۶۰]

یہ دنیا ایک دکھاوا ہے جہاں جاہ و قسمت کا اندازہ قوت اور حاکمیت سے لگایا جاتا ہے۔ ظاہری چکا چوند ہی شان و شوکت کا معیار ہے۔ دنیا کے دستور میں اس درجہ روز افزوں ترقی کے باوجود بھی دنیا کے معیار ہی پر قائم و دائم ہیں۔

کھا رہے ہیں سب فریب رنگ و بو

ہر حقیقت جوں کی توں دستور ہے [۶۱]

شاعرہ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ وطن سے دور دیار غیر میں بسر کیا لیکن وطن سے دور رہ کر بھی وہ وطن سے بے پناہ محبت کرتی ہیں۔ اس محبت کا اظہار انھوں نے بارہا مرتبہ اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ وطن کی یاد کو شاعرہ نے ٹوٹے ہوئے تارے سے تشبیہہ دی ہے:

نقش بن جاتی ہے ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح

جب بھی پردیس میں آتی ہے مجھے دیس کی یاد [۶۲]

شاعرہ نے دکھی دلوں پر برجستگی لیے انداز میں طنز کیا ہے۔ ان کا اسلوب شگفتہ اور سادہ ہے۔ شاعرہ نے محاورات کا انداز بھی بر محل انداز میں کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

دُکھے دلوں کی نزاکت ارے معاذ اللہ

کسی پہ لطف ہوا اور آنکھ بھر آئی [۶۳]

شاعری فنِ لطیف ہے جس کے ذریعے خیالات واحساسات کی ترجمانی ممکن ہے۔ ایک بہترین شاعر کی کامیابی یہ ہے کہ وہ جذبات واحساسات کو اس طور سے پیش کرے کہ حقیقت کا گماں ہو اور قاری خود کو اس کیفیت سے گزرتا ہوا محسوس کرے۔ مثلاً خوشی، غم، نفرت ومحبت کے جذبات۔ [۶۴]

سحاب نے وطن کو گلشن سے موسوم کیا ہے۔ گلشن میں لگے قسم قسم کے پھول اس کی خوبصورتی اور رعنائی میں اضافہ کرتے ہیں۔ گلشن کی خوبصورتی میں مزید اضافہ تب ہوگا جب گلشن کے تمام پھول اکٹھے ہو کر ایک ساتھ مہکیں گے۔

ہمیں تو اس چمن کو گلشنِ عالم بنانا ہے

ابھی بچھڑے ہوؤں کو ایک ہی مرکز پہ لانا ہے [۶۵]

نظم 'ابھی تو' میں ابھی کی تکرار ولولے کی عکاس ہے۔ کام کی لگن اور کر گزرنے کا جذبہ لیے مناسب حکمت عملی سے بھی ضروری امور کو وقت کا ضیاع کیے بغیر انجام دینا ہے۔ نظم میں جوش، جذبہ اور وطن عزیز کے حصول کی سرشاری کا

جذبہ جھلکتا ہے۔ شاعر ہمیشہ اپنے ارد گرد کے حالات کو موضوع بناتا ہے قیام پاکستان سے قبل شعرا کے ہاں جو بے یقینی کی فضا قائم تھی قیام پاکستان کے بعد نئے عزم اور نئے ولولے نے جگہ لے لی۔

سحاب نے بحیثیت خاتون نسائیت کے بعض ایسے جذبوں کی ترجمانی کی ہے جو ایک عورت ہی بہتر انداز میں پیش کر سکتی ہے۔ انہوں نے عورت کی ذات کو تلاشا ہے اور عام عورت کی زندگی کو موضوع بحث لیا ہے وہ اپنی نظموں میں معتدل رویہ اپناتی ہیں۔ اس حوالے سے وحیدہ نسیم لکھتی ہیں۔

> ''چونکہ قدرت نے عورت کے جذبات میں بے پناہ شدت رکھی ہے اس لیے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ عورتوں کی زبان کی بنیاد ہی جذبات نگاری پر پڑی اور ان کی زبان میں جذبات نگاری اور زور بیاں کے لیے الفاظ کا جس قدر بڑا ذخیرہ ملتا ہے کسی ادیب یا شاعر کے یہاں نہیں ملے گا کیونکہ عورت ایک طرف جذبات کا مخزن ہے دوسری طرف الفاظ کا خالق۔'' [۲۲]

نظم 'اخبار بیچنے والی بڑھیا' میں ایک ایسی بوڑھی عورت کی عکاسی کی گئی ہے جو عمر کے آخری حصے میں پہنچ کر اپنی کفالت کی ذمہ داری نبھاتے ہوئے صبح سویرے ایک موڑ پر کھڑے ہو کر راہ گیروں سے اخبار بیچتی جاتی ہے۔ اس کا کام صبح سے شام تک اخبارات بیچنا ہے اور ایک ایک پنی (Penny) (برطانوی سکہ) کے بدلے یہ اخبارات صبح سے شام تک بیچتی ہے جب تک اخبارات ختم نہ ہو جائیں۔ سحاب نے اس بوڑھی عورت کی احساس ذمہ داری کی طرف توجہ دلائی ہے جو بے مصرف زندگی نہیں گزارتی اور یہ بوڑھی عورت جس کے جسم کا گوشت ختم ہو کر لٹکی ہوئی کھال کی طرح ہے۔ اس نے مصنوعی دانت اور مصنوعی پلکوں کے ذریعے عمر کو چھپایا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود وہ زندگی کو ایک بوجھ سمجھ کر نہیں گزارتی بلکہ اس کا لباس اور بناؤ سنگھار اس میں زندگی کی رمق ظاہر کرتا ہے۔ سحاب 'اخبار بیچنے والی بڑھیا' کی سراپا نگاری اس طور سے کرتی ہیں کہ بڑھیا کا مکمل تصور آنکھوں کے سامنے واضح ہو جاتا ہے۔

چہرے پہ ہاتھوں پہ غازے کی اک باریک رمق
دانتوں کی موتی سی چھب مانگی ہوئی
اور مصنوعی سے پلکوں کے گھنے سائے بھی
سر کی ٹوپی پہ لگائے کئی مصنوعی پھول
کانپتے ہاتھوں میں ''ٹن لاگر'' کا
پھٹے دستانوں سے سرخی لگے ناخن جھانکیں
کانپتی انگلیاں سگریٹ بھی جلا لیتی ہیں

سرخیاں نظروں ہی نظروں سے پیے جاتی ہے
ہے فقط کام کی گھنٹی سے یہ چلتی بڑھیا [۶۷]

سحاب کی شاعری میں ایک ایسی عورت کا تصور ملتا ہے جو وفا کی تلاش میں سر گرداں ہے۔ سحاب کے ہاں رقیب ایک ایسی عورت ہے جو سوکن کی صورت میں موجود ہے لیکن سحاب اس سوکن سے متنفر نہیں بلکہ اس کے آنے والے کل پر افسوس کرتی ہے کہ اسے بھی دھوکہ ہی ملنا ہے۔

نظم 'سوکن سے' قطعات پر مشتمل ہے اس کا ہندی لب ولہجہ ہے نظم میں الفاظ اگن، کجرا، اکھین، نینن، بگین، ابکی اور موہن ہندی تہذیب اور رسم ورواج کے عکاس ہیں۔ سوکن کے لیے ہندی زبان کا لفظ نردوہی برتا ہے جس میں سوکن سے محبت کا احساس بھی جھلکتا ہے۔ مرد کے فریب میں عورت خود کو بھلا بیٹھتی ہے لیکن یہ عارضی رفاقت بھول کر مرد لا تعلق بن جاتا ہے۔ 'سوکن سے' میں شاعرہ نے ہندی الفاظ کا بر محل استعمال کر کے ایک مخصوص فضا تعمیر کی ہے۔ انہوں نے کامل خوبصورتی سے ہندی الفاظ کو شاعری کا حصہ بنایا ہے کہ کہیں بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ ان کی شاعری کا موضوع ارد گرد بکھری داستانوں سے اخذ شدہ ہے جنھیں شعری قالب میں ڈھال کر سوچ کو شاعری کا بہترین ذریعہ بنایا ہے۔ اس نظم میں ربط اور تسلسل کا احساس ہے۔ ان کے ہاں جذبات واحساسات کی ایسی فضا تخلیق کی گئی ہے۔ یہ ایک نیا اسلوب ہے ایک منفرد انداز جو کہ ان کی انفرادی سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔

بال بال میں ہمری سجا ہے
پور پور پہ ہمری لکھا ہے
جیسے وہ تمکا چاہت ہیں
ہمکا بھی وہ چاہت تھے
نین جوت جلاوت تھے
نردوہی سے کیسے کہن ہم
اِک دن ایسا آوے گا
تمرا دل بھی ترسے گا
جب آنکھ سے ساون برسے گا [۶۸]

سحاب نے نظم میں نئے موضوعات کو رواج دیا ہے۔ عورت کی سوچ کے دھارے مرد کی ذات سے وابستہ ہو کر اسی میں مقید ہو کر رہ جاتے ہیں اور مرد کی فطرت کو جان کر بھی اس قید سے خود کو فرار نہیں کر پاتی۔ ان کے ہاں فطری سوچ جذباتیت سے مزین نظر آتی ہے۔

سحاب نظم 'اے میرے ضدی ہٹیلے بچو' میں ہٹیلے نوجوانوں سے مخاطب ہوتی ہیں کہ اب اس غصے اور جھوٹے ہتھیار کو چھوڑ کر جذباتیت کی بجائے سوچ اور تدبیر سے کام لے کر آئندہ آنے والی نسلوں کو اس روش پر چلنے سے روکو۔ یورپ میں مذہبی بنیادوں پر متعدد مواقعوں پر اشتعال انگیز بیانات جاری کیے جاتے ہیں۔ سحاب نظم میں مذہبی حوالہ کے طور پر کہتی ہیں کہ یورپی ممالک کے ذہنوں میں تصور بیٹھ گیا ہے کہ نوجوانوں کے ہاتھوں میں پستول ان کے مذہبی اختلافات کی بنا پر ہیں اور یہی اختلاف کسی خاص قوم کے خلاف نفرت اور محاذ آرائی کی فضا کو جنم دیتی ہیں۔ عالمی قوتیں ہلکا سا شائبہ ملنے پر بھی ان کے خلاف کمربستہ ہو جاتی ہے۔ یہ لڑائی پھر دو افراد کی جوشیلی کیفیت تک محدود نہیں رہتی بلکہ پوری قوم کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ عالمی بالادستی کی بنا پر حاکم محکوم سے التجا کا متمنی ہوتا ہے جبکہ جوشیلے نوجوانوں نے حق وصول کرنے کے لیے محکوم ہونے سے انحراف کیا اور اس پاداش میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

ساری دنیا کی نگاہیں اسی پسٹل پر رکیں
کون سی قوم کا لیبل نکلے
اب تو لیبل کا ہے بس بھاؤ چڑھا
اب لڑائی کی مشق بدلی ہے
سوچ، تدبیر کی تلوار اٹھالو اب تو
جھوٹے ہتھیار انھیں لوٹا دو [۶۹]

سحاب شاعری میں دیگر زبانوں کے الفاظ کو بآسانی ضم کر لیتی ہیں۔ انھیں الفاظ کے درست استعمال پر خاصا عبور حاصل ہے۔ نظم میں انھوں نے انگریزی لفظ '' پسٹل '' استعمال کیا ہے۔ اردو شاعری میں عربی اور فارسی کے الفاظ متعدد مرتبہ استعمال کیے جاتے ہیں لیکن انگریزی الفاظ کا استعمال خال خال ہی ملتا ہے۔ اسی طرح اخبار بیچنے والی بڑھیا میں ایپرن، کیو، پینی، [۷۰] نظم 'آج کی نسلوں کا یہ وقت رگ جاں' میں ہیوی ڈیمانڈ، سلور، [۷۱] نظم 'لینڈ لیڈی' میں نن آف مائی بزنس، تھینک یو، مائی ڈیئر، ایڈریس، مینٹین، لسٹ، جیلس، اینجل [۷۲] جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

نظم ''تم جو تھے دورات کے دولھا'' چار بند پر مشتمل نظم ہے جس میں محبوب کی بیوفائی پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ محبوب اپنی یادوں کی سوغات دے کر پھر واپس نہیں لوٹا اس کے دلنشیں الفاظ دل کو بہلاتے ہیں۔ شاعرہ اظہار خیال کے لیے مختلف انداز اپناتی ہیں منفرد اسلوب تشکیل دے کر اظہار کے بہترین وسیلے ڈھونڈتی ہیں اور خوب سے خوب تر کی سعی کرتی ہیں اس ضمن میں تشبیہات واستعارات اور علامات کا بر محل استعمال کر کے مشاہدات وافکار کو مزین کر کے شعر تخلیق کیے ہیں۔ سحاب کے شعری اسلوب میں تشبیہ کی خاص اہمیت ہے کسی ایک چیز کو دوسری سے مشابہہ قرار دے کر اس کی صفات بیان کرتی ہیں۔

چاندی جیسے بول تمھارے
جھم جھم کرتے چاند ستارے
تن من کو بہلاتے ہیں
پلکوں کے فانوسوں پر [۳]

سحاب قزلباش نے محبوب کے الفاظوں کو چاندی سے تشبیہ دی ہے مراد چاندی جیسی چمک اور خوبصورتی ان الفاظ سے جھلکتی ہے شاعرہ نے تشبیہ واستعارے سے محبوب کی دلربائی اور ہر جائی فطرت کی واضح عکاسی کی ہے ماتھے کو چاند اور ٹھوڑی کو تارا کہہ کر خوبصورتی کی یکتائی کا اشارہ ہے۔

پر یہ آرسی مصحف کا آئینہ
دیکھ کے ہر چہرے کا سایہ
بات یہی دوہراتا ہے
ماتھے چاند اور ٹھوڑی تارا
تم جیسا کوئی اور نہ پیارا [۴]

سحاب نے شاعری میں علامت نگاری سے بھی کام لیا ہے جذبات کے اظہار کے لیے فطری مناظر کو وسیلہ بنایا ہے۔ انھوں نے مرئی اور غیر مرئی دونوں طرح کی علامتیں برتی ہیں جن میں پھول، بارش، اندھیرا اور ساون وغیرہ شامل ہیں۔

جدید اردو شاعری کی نمائندہ خواتین نے فطری مناظر کی تصویر کشی کے ساتھ عورت کے جذبات کو وسیلہ اظہار بنایا ہے اس قبیل میں کشور ناہید، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض کے ساتھ ساتھ سحاب نے بھی عورت کی ذات کو تلاشا اور تراشا۔

انھوں نے اپنی شاعری میں عورت کے مختلف روپ اور انداز بیان کیے۔ ان کے ہاں عورت ایک احساس کا نام ہے جو شناخت کی متمنی ہے۔ سحاب نے مرد کی فطرت کو اجاگر کرنے کے لیے جنس نگاری کی تماثیل بھی پیش کیں۔ نظم 'ایک اچھا سا خیال' میں لکھتی ہیں۔

اور اب جسموں کے انبار میں مدہوش سراپا تیرا
خود فراموشی کے ہیں جام و سبو ساتھ لیے
مسکراتے لبوں پہ لب رکھے
وہی خاموش نگاہیں پھر سے
رہتی دنیا کے عہد و پیماں لیے
اور خاموش زباں
نقرئی چاند کی ٹھنڈک میں چمکتے الفاظ
پھر کسی نرم دھڑکتے دل میں
کندہ کرنے کے لیے
اک نئے جسم کو زخمی کرنے
زندگی پھر سے مسکرائی ہے [۷۵]

اردو نظم کا دامن متنوع مضامین سے مالا مال ہے۔ اس میں مذہبی، اخلاقی، سماجی، سیاسی، معاشی مسائل، حسن و عشق کے قصے اور خوبصورت فطری مناظر کی عکاسی احسن انداز میں جگہ پاتے ہیں۔ طویل نظم کے لیے تخیل کی ایک مکمل فضا قائم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے پوری نظم میں وحدت تاثر کو قائم رکھنا بہت ضروری ہے۔ طویل نظم کا آغاز مغرب میں بہت پہلے ہوا۔ عہد قدیم میں لکھی جانے والی نظموں میں دانتے کی ڈیوائن کامیڈی ایک طویل رزمیہ نظم ہے جس میں اس دور کی سماجی اور نفسیاتی عکاسی کی گئی ہے اردو میں طویل نظم مغربی شعرا کی تقلید کے طور پر سامنے آئی۔ [۷۶]

'لینڈ لیڈی' میں ترجمانی ہے اس عورت کی جو تنہائی کا دکھ سہتی اور خود کفالت کی ذمہ داری اٹھاتی ہے لیکن اگر اپنی پریشانیوں اور تنہائی کا تذکرہ کرتی ہے تو یورپ کی ایسی لاتعداد مثالوں سے چپ کرا دیا جاتا ہے جو خود کفالت کی ذمہ داری بخوبی نبھا رہی ہیں اور تنہا اپنی زندگی کے ڈگر پر چل رہی ہیں معاشرے میں عورت کا مقام اس کے شوہر سے پہنچانا جاتا ہے اور اگر شوہر ہی اس کی تذلیل کرے تو پھر عورت کے اندر خود اعتمادی نہیں رہتی۔

تم اکیلی تو نہیں ہو، عورت!

تم سے اچھی، حسین دوشیزائیں
سارے یورپ میں کام کرتی ہیں
گھر میں۔۔۔دفتر میں کام کرتی ہیں
برف، بارش میں، کام کرتی ہیں
مسکرا کر کلام کرتی ہیں
اور ادھر تم۔۔۔کمال کرتی ہو
چین سے گھر میں راج کرتی ہو ''

سحاب نے اپنے الفاظ کے انتخاب میں ایسے اسلوب کو پیش نظر رکھا جو حقیقت پسندی اور امیجری کا امتزاج ہے ان کی شاعری میں محبوب سے جدائی کا نوحہ ہے ان کی زندگی کا حاصل ان کی تحریروں میں پنہاں ہے۔اس حوالے سے یونس حسن لکھتے ہیں۔

''جدید شعرا نے لسانی حوالے سے نئی نظم کے اندر جو نئے تجربات کیے ہیں اس سے الفاظ اور مفاہیم کے اندر جہاں موزونیت پیدا ہوئی ہے وہاں اس کے اندر طنز کی کیفیت نے جنم لیا ہے جس کے تناظر میں معاشرتی اور طبقاتی ناہمواری کی متعدد اشکال ابھرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔''[۷۸]

سحاب زندگی کی حقیقی تصویر پیش کرتی ہیں ان کے ہاں عورت کی اصل جنت اس کا اپنا گھر ہے وہ عورت کی بے جا آزادی، روایات سے انحراف اور مغربی معاشرت پر تنقیدی رویہ اپناتی ہیں ان کے ہاں معاشرے کا بہترین روپ نہیں بلکہ عصر حاضر کے معاشرتی انحطاط کی تصویر ہے

سحاب کی شاعری کے تفصیلی مطالعہ سے ان کی شاعری میں روایتی اور عصری رجحانات دونوں کی عکاسی ملتی ہے انھوں نے منفرد اسلوب اور موضوعات کی بدولت شاعری میں خاص پہچان بنائی ہے۔ان کا شعری مجموعہ مختصر ہونے کے باوجود ان کی منفرد سوچ کی عکاسی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ زاہدہ حنا،سحاب قزلباش : یادوں کی برسات،روزنامہ جنگ ۲۰۰۴ء۔۸۔۶۱،ص ۲

۲۔ سحاب قزلباش،لفظوں کے پیرہن (کراچی:اشارات پبلی کیشنز،۲۰۰۲)،ص ۱۰

۳۔ امداد امام اثر،کاشف الحقائق (مرتبہ) وہاب اشرفی،(نئی دہلی:ترقی اردو بیورو،۱۹۸۲ء)،ص ۶۴۲

۴۔ سحاب قزلباش،لفظوں کے پیرہن،ص ۵

۵۔ ایضاً،ص ۶۱

۶۔ علی جواد زیدی،انیس کے سلام،(نئی دہلی: ترقی اردو بیورو،۱۹۸۱ء)،ص ۲۳

۷۔ سحاب قزلباش،"دمشق میں حضرت زینبؓ کے مزار پر"،مشمولہ لفظوں کے پیرہن،۱۸

۸۔ ــــــ،ص ۹۱

۹۔ وزیر آغا،اردو شاعری کا مزاج،(لاہور: مجلس ترقی ادب،۲۰۰۸ء)،ص ۲۰۷

۱۰۔ ارشد محمود نا شاد،ڈاکٹر، اردو غزل کا تکنیکی، ہیتی اور عروضی سفر(لاہور: مجلس ترقی ادب،۲۰۰۸ء)

۱۱۔ ایضاً،ص ۲۳۸

۱۲۔ اختر انصاری،غزل اور غزل کی تعلیم (لاہور: مکتبہ عالیہ،۱۹۸۷)،ص ۴۳

۱۳۔ سحاب قزلباش،لفظوں کے پیرہن،ص ۵۲

۱۴۔ ایضاً،ص ۸۲

۱۵۔ ــــــ،ص ۲۷

۱۶۔ ــــــ،ص ۲۶

۱۷۔ ---، ص ۲۷

۱۸۔ ---، ص ۴۴

۱۹۔ ---، ص ۴۷

۲۰۔ ---، ص ۴۷

۲۱۔ ---، ص ۶۰

۲۲۔ ---، ص ۴۹

۲۳۔ ---، ص ۵۰

۲۴۔ ---، ص ۴۶

۲۵۔ ---، ص ۶۶

۲۶۔ ---، ص ۶۹۔۶۹

۲۷۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، جدید شاعری، (علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۵)، ص ۴۳۔

۲۸۔ زبیر رضوی، اردو نظم (۱۹۶۰ء کے بعد)، (دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۵)، ص ۵۲ (مضمون کا عنوان: جدید نظم کی شعریات اور بیانیہ)

۲۹۔ سحاب قزلباش، ''نئی زمین نیا آسماں بنانا ہے''، مشمولہ لفظوں کے پیرہن، ص ۷۰۔۷۱

۳۰۔ ---، ''ابھی تو---ا''، مشمولہ لفظوں کے پیرہن، ص ۷۲

۳۱۔ ---، ص ۷۲

۳۲۔ شمس الرحمن فاروقی، تعبیر کی شرح، (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۴)، ص ۱۲۲۔۱۲۳

۳۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، مخزن، (لاہور: قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم باغ جناح، جلد ۱۱، شمارہ ۱، ۲۰۰۱)، ص ۵۰

۳۴۔ سحاب قزلباش، ''آج کی نسلوں کا یہ وقت رگ جاں ہے'' مشمولہ لفظوں کے پیرہن، ص ۷۸۔۷۹

۳۵۔ ۔۔۔،ص۷۹

۳۶۔ ۔۔۔،'' محبوب کی ماں کے نام''، مشمولہ لفظوں کے پیرہن، ص۸۳

۳۷۔ ۔۔۔،'' عورت کے تین روپ''، مشمولہ لفظوں کے پیرہن، ص۸۸

۳۸۔ ۔۔۔،'' دو ننھی لڑکیاں''، مشمولہ لفظوں کے پیرہن، ص۹۹

۳۹۔ ۔۔۔،'' لینڈ لیڈی''، مشمولہ لفظوں کے پیرہن، ص۱۱۶

۴۰۔ احسان دانش، جہان دگر، (لاہور: خزینہ علم وادب ۲۰۰۱ء)، ص۲۲۳۔

۴۱۔ سحاب قزلباش، لفظوں کے پیرہن، ص۴۲

۴۲۔ ۔۔۔،ص۲۸۔۔۔

۴۳۔ ۔۔۔ص۲۹۔۔۔۔

۴۴۔ فیروزالدین، مولوی، الحاج، فیروزاللغات، (لاہور: فیروز سنز، ۲۰۰۵ء) ص۳۴۳

۴۵۔ نند کشور وکرم، عالمی ادب اردو، دہلی: کرشن نگر، ۲۰۰۵ء، ص۳۵۳۔ ۳۵۴۔

۴۶۔ سحاب قزلباش، ص۳۴ لفظوں کے پیرہن،

۴۷۔ ۔۔۔،ص۳۸

۴۸۔ ۔۔۔،ص۴۳۔۔۔

۴۹۔ ۔۔۔،ص۳۰

۵۰۔ ۔۔۔،ص۳۱

۵۱۔ اکبر حسین قریشی، ڈاکٹر، مطالعہ تلمیحات واشارات اقبال، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۶، ص۲۰۹

۵۲۔ سحاب قزلباش، لفظوں کے پیرہن، ص۳۲

۵۳ ۔۔۔۔۔ص۳۳

۵۴ ۔۔۔۔، ص۳۶

۵۵۔ ۔۔۔، ص۵۴

۵۶ ۔۔۔۔، ص۵۶

۵۷ ۔۔۔۔، ص۵۸

۵۸ ۔۔۔۔، ص۴۵۔

۵۹ ۔۔۔۔، ص۵۱۔

۶۰ ۔۔۔۔، ص۵۲

۶۱ ۔۔۔۔، ص۵۲

۶۲ ۔۔۔۔، ص۵۵

۶۳۔ ۔۔۔، ص۹۴

۶۴۔ خاور اعجاز، نئی پاکستانی اردو غزل ۱۹۷۰ءکی دہائی کے حوالے سے (لاہور: ابلاغ پبلشرز، ۲۰۰۱)، ص۱۲۔

۶۵۔ سحاب قزلباش، ''ابھی تو۔۔۔ا''، مشمولہ لفظوں کے پیرہن، ص۲۷

۶۶۔ وحیدہ نسیم، عورت اور اردو زبان، (کراچی: غضنفر اکیڈمی پاکستان، ۹۷۹۱)، ص۹۰۱۔۱۱۰

۶۷۔ سحاب قزلباش، ''اخبار بیچنے والی بڑھیا''، مشمولہ لفظوں کے پیرہن، ص۷۷

۶۸۔ ۔۔۔، ''سوکن سے''، مشمولہ لفظوں کے پیرہن، ص۲۹

۶۹۔ ۔۔۔، ''اے مرے ضدی ہٹیلے بچو''، مشمولہ لفظوں کے پیرہن، ص۱۰۱

۷۰۔ ۔۔۔، ''اخبار بیچنے والی بڑھیا''، مشمولہ: لفظوں کے پیرہن، ص۷۶۔۷۷

۷۱۔ ۔۔۔، ''آج کی نسلوں کا یہ وقت رگ جاں ہے''، مشمولہ: لفظوں کے پیرہن، ص۷۸۔۷۹

۷۲۔ ۔۔۔، ''لینڈلیڈی''، مشمولہ: لفظوں کے پیر ہن، ص۱۱۸۔۱۲۶

۷۳۔ ۔۔۔، ''تم جو تھے دورات کے دولھا''، مشمولہ لفظوں کے پیرہن، ص۱۰۶

۷۴۔ ۔۔۔، ص۱۰۶

۷۵۔ ۔۔۔، '' ایک اچھاسا خیال''، مشمولہ لفظوں کے پیرہن، ص۱۰۴

۷۶۔ روشن اختر کاظمی، اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقائی، (نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۴)، ص۸۱

۷۷۔ سحاب قزلباش، '' لینڈلیڈی''، مشمولہ لفظوں کے پیرہن، ۱۲۲۔۱۲۳

۷۸۔ یونس حسن، قومی زبان، مشمولہ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۶، جلد۷۶، شمارہ ۱۲، ص۳۵

ماحصل

سحاب قزلباش اُردو کے نامور شاعر و مصنف آغا شاعر قزلباش کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ آغا شاعر کی شخصیت کا عکس ان کے بچوں میں بھی واضح نظر آتا ہے۔ انھوں نے ادبی ذوق ورثے میں پایا اور علم و ادب کو اپنی زندگی کا شعار بنایا۔ جب آغا شاعر کی وفات ہوئی اس وقت سحاب بہت کم عمر تھیں۔ انھیں اپنے والد صاحب کے ساتھ گزرے چند ایک واقعات خواب کی طرح یاد تھے۔ والد کی وفات کے بعد والدہ نے بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری احسن انداز سے سنبھالی۔ آغا شاعر کی وفات کے بعد ان کے منجھلے بیٹے آغا سرخوش قزلباش نے دہلی میں چمنستان رسالے کی ادارات سنبھالی۔ آغا سرخوش کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ گھر پر ادبی محفلوں کا باقاعدہ انعقاد کیا جاتا۔ مردان خانے میں عورتوں کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ آغا سرخوش قزلباش سے قبل آغا شاعر قزلباش بھی ان ادبی محفلوں کا اہتمام کرتے ان کے بعد ان کے بیٹے یہ فرائض خوش اسلوبی سے نبھاتے رہے۔ سحاب تین بھائیوں سے چھوٹی اور اکلوتی بہن تھیں اس لیے اس کی پرورش بہت ناز و نعم سے ہوئی۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے عربک ہائی سکول سے حاصل کی بعد میں عربک سکول چھوڑ کر کوئن میری سکول دلی میں داخلہ لے لیا۔ سکول کی باقاعدہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ادبی کتب کے مطالعے کا ذوق بھی انھیں بچپن سے تھا۔ گھر پر بھی ادبی ماحول رائج تھا۔ کم عمری میں انھوں نے اردو کی بہترین داستانیں سن رکھی تھیں۔ اس کے علاوہ اس وقت کے شائع ہونے والے ادبی رسالوں کا مطالعہ ان کا بہترین مشغلہ تھا۔

ریڈیو کے پروگرام سن کر انھیں بھی ریڈیو پر کام کرنے کا شوق پیدا ہوا اور بڑے بھائی سے اجازت لے کر آل انڈیا ریڈیو سروس میں بطور نعت خواں سے آغاز کیا۔ بعد میں انھوں نے فوجیوں بھائیوں کے پروگرام میں بھی اپنی آواز کا جادو جگایا ان کے ریڈیو پر کام کے حوالے سے۔ ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

> ''آغا صاحب کے انتقال کے بعد برقع اتر گیا۔ گھرانے کی کفیل بن گئیں۔ جنگ شروع ہوئی تو کئی مسلمان گھرانوں کی لڑکیاں باہر نکلنے پر مجبور ہو گئیں۔ سحاب بھی ان میں شامل تھی۔''[1]

سحاب قزلباش خوش شکل خوش آواز اور متناسب جسم کی لڑکی تھیں۔ وہ شروع میں بہت کم گو تھیں۔ بعد میں آل انڈیا ریڈیو میں کام کرتے ہوئے خود اعتمادی نے ان کی شخصیت کو مزید نکھارا۔ اسی زمانے میں سحاب نے شاعری اور افسانہ نگاری کا آغاز لیا۔ ابتدا میں ان کے افسانے 'چمنستان' رسالے میں شائع ہوتے رہے۔ تحریک آزادی کے جلسوں میں بھی

سحاب پیش پیش رہیں اور تب ہی انھوں نے ایک بار جلسے میں جدوجہد آزادی کے حوالے سے نظم سنائی جس نے سامعین کے دلوں کو گرما دیا۔

ان کے دوستوں کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ سحاب قزلباش دہلی تہذیب و تمدن کا نمونہ تھیں۔ انھوں نے افسانوں میں دہلی زبان کے الفاظ و محاورات با کثرت برتے ہیں۔ وہ بہت حساس تھیں دوسروں کے دکھ درد اور پریشانیوں پر خود بھی پریشان ہو جاتیں۔ ہمدرد اس قدر کہ کسی کی تکلیف برداشت نہ ہوتی حتی الوسع کوشش کر کے دوسروں کی مدد کرتیں۔ بہت مہمان نواز تھیں۔ لندن میں قیام کے عرصے میں جو بھی پاکستانی ادیب یا شاعر تشریف لاتے سحاب ان کی خاطر مدارت میں کسی طور کمی نہ آنے دیتیں۔

قیام پاکستان کے بعد سحاب نے ریڈیو پاکستان لاہور میں ملازمت کی۔ سحاب خوش شکل و خوش وضع شخصیت تھیں۔ انھیں چاہنے والوں میں میراجی اور نخشب جارچوی کا نام سر فہرست تھا لیکن سحاب نے والدہ صاحبہ کی پسند پر گل یوسف سے شادی کی۔ گل یوسف نیول آفیسر تھے۔ سحاب کی والدہ نے یہ فیصلہ گل یوسف کی بہتر ملازمت کی بنیاد پر کیا۔ سحاب کو شادی کے بعد ایک مکمل گھریلو عورت کے طور پر زندگی گزارنی تھی۔ شادی کے بعد سحاب نے مستقل طور پر کراچی رہائش اختیار کر لی شادی کے کچھ عرصے بعد ایک دن نظامی صاحب نے ریڈیو پاکستان کراچی کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے سحاب سے بغیر کسی معاوضہ کے دوبارہ اپنی خدمات پیش کرنے کی درخواست کی تو سحاب انکار نہ کر سکی اور اس طرح دوبارہ ریڈیو سروس میں کام کا آغاز کیا۔ اس کے ساتھ ہی سحاب کی عائلی زندگی میں مسائل کھڑے ہونے لگے اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ اجنبیت اور لاتعلقی کی دیوار اتنی بڑھی کہ سحاب کا وجود گل یوسف کے لیے بوجھ بن گیا۔ سحاب کو اپنی اور اپنے بچے کی کفالت کی ذمہ داری خود سنبھالی پڑی اور بالآخر اس کا منطقی انجام طلاق کی صورت میں ہوا۔

اردو افسانہ نگاری میں سحاب کے افسانوں کا ایک مجموعہ منظر عام پر آیا اس کے بعد انھوں نے کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ سحاب نے اپنے افسانوں میں رومانویت نگاری سے کام لیا ہے ان افسانوں میں نوعمر کھلنڈری طبیعیت کی لڑکیوں کے احساسات بیان کیے گئے ہیں۔ انھوں نے مفلوک الحال اور استحصال کا شکار افراد کی زندگیوں کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے ان افسانوں میں داستان عشق و محبت اور رقابت کے عناصر بھی شامل ہیں۔ ان کے افسانوں میں رومانویت اور حقیقت نگاری نے معنویت میں اضافہ کیا ہے۔ سحاب نے حقیقت نگاری کرتے ہوئے غریب، یتیم اور مجبور افراد کی عمدہ مرقع کشی کی ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار بھی تقریباً صنف نازک ہیں ان کہانیوں کی سوچ کا احاطہ صنف نازک کے خیالات و تصورات اور ان کے ساتھ پیش آنے والے سماجی و معاشرتی و معاشی مسائل ہیں۔ عورت ہمارے ہاں ایک مظلوم

طبقہ ہے انھوں نے معاشرے کے جبر واستحصال کے نتیجہ میں بدلتے رشتوں کو بخوبی بیان کیا ہے۔ سحاب کے افسانوں میں فطرت نگاری بھی پائی جاتی ہے انھوں نے فطری مناظر سے افسانوں کی فضا تشکیل دی ہے ان افسانوں میں رومان اور تخیل پایا جاتا ہے۔ سحاب معاشرتی اصلاح کا جذبہ رکھتی تھیں انھوں نے اپنے ارد گرد بکھرے مسائل کو افسانوں میں بیان کیا ہے۔ ان کے افسانوں کا انداز بیانیہ ہے۔ انھوں نے افسانوں میں کردار نگاری اور ڈرامائی کیفیت سے چاشنی پیدا کی اور دلکش اسلوب اور زبان و بیان سے اردو افسانے کو نئی جہات سے روشناس کرایا۔ انھوں نے افسانوں میں آغا شاعر قزلباش کے انداز تحریر کو اپنایا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے فقرات میں اظہار مدعا کر کے ان میں شاعرانہ انداز کی جھلک دکھاتی ہیں۔ سحاب کے افسانوی مجموعے میں بھی شاعرانہ انداز کی چھاپ نظر آتی ہے۔ وہ ایک لفظ کو بار بار دہرا کر اس میں موسیقی کا تاثر اور شاعرانہ آہنگ پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ بعض جگہوں پر انھوں نے معمولی واقعے کو بیان کرتے ہوئے بھی کافی تفصیل پیش کی ہے جس سے افسانے کی وحدت اور اختصار کا تاثر مجروح ہوتا ہے۔ سحاب نے سولہ سال کی عمر میں اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع کیا۔ اتنی کم عمری میں ان کی سوچ اور خیالات بھی ان کی عمر کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں سہیلیوں کے ساتھ گزرے وقت کی یادیں بھی ہیں اور سکول چھوٹ جانے کا افسوس بھی۔ یہ افسانے دراصل سحاب کی اپنی زندگی کا مرقع ہیں۔

سحاب قزلباش نے اپنے حلقہ احباب میں شامل افراد کی زندگیوں کو خاکوں میں محفوظ کیا ہے۔ ان خاکوں میں ادبی و غیر ادبی شخصیات شامل ہیں۔ ان خاکوں سے موضوع شخصیت سے رابطہ کی نوعیت سامنے آتی ہے۔ ان خاکوں کے ساتھ سحاب کی اپنی شخصیت بھی منظر عام پر آتی ہے اور ان کے حالات زندگی سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ سحاب نے بیشتر خاکے شخصیات کی وفات پر لکھے ہیں جن میں ان کے حالات زندگی اور ادبی قدر و منزلت کو بیان کیا ہے۔ ان میں سے بعض خاکے تاثراتی مضامین کا درجہ رکھتے ہیں جن میں مصنفہ نے ایک دو ملاقاتوں پر اپنے تاثرات پیش کر دیے ہیں۔ ان میں سے شخصیت کے ظاہر و باطن سے شناسائی نہیں ہوتی۔

سحاب نے خاکوں میں شخصیت کے محاسن اجاگر کیے ہیں۔ انسان خامیوں اور خوبیوں کا مرقع ہے۔ سحاب کی نظر ان کے اچھے افعال کی طرف مبذول رہی۔ اپنی البتہ جہاں کہیں شخصیت کی خامیوں کا تذکرہ کیا ہے اس درجہ محتاط انداز اختیار کیا ہے کہ گویا مرنے والے کی دل آزاری نہ ہو۔ سحاب کا حسن بیان ہے کہ انہوں نے مردہ اشخاص سے بھی بے تکلفی کا انداز اپنایا ہے۔ انداز بیان شستہ اور برجستہ ہے وہ واقعات کو تسلسل سے بیان کرتی ہیں۔ ان کے خاکے اسلوب بیان کی سلاست و دلکشی اور دلچسپ ہونے کی بنا پر اثر پذیر ہیں۔ انہوں نے خاکوں میں اشخاص کے ظاہری خدوخال، عادات اور مزاج

کا بھی بھرپور نقشہ پیش کیا ہے۔ آغا آفتاب قزلباش نے اپنے مضمون 'پیغام آشنا گویم' میں سحاب کے میراجی پر لکھے جانے والے خاکے پر فیض صاحب کے تعریفی کلمات کا حوالہ دیا ہے ان کے خط کا حوالہ دیتے ہوئے یوں بیان کرتے ہیں:

''مضمون پسند آیا۔ ایسا مضمون لکھوانے کے لیے مرنے کو جی چاہتا ہے''[۲]

سحاب نے مختلف شخصیات پر خاکے لکھے ہیں لیکن میراجی کا خاکہ ادبی حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں سحاب نے ایک ماہر نفسیات کی طرح میراجی کی شخصیت کو پرت در پرت کھولا ہے۔ ن۔م۔ راشد کے خاکے میں ان کی وفات کے بعد نذر آتش کرنے پر تاسف کا اظہار ہے۔ فیض احمد فیض کا خاکہ ان کی زندگی کی صعوبتوں سے مزین ہے۔ زیڈ۔ اے۔ بخاری ریڈیو سروس کے لیے روح رواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ریڈیو سروس کے حوالے سے ان کی قابل قدر خدمات کا تفصیلی انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ 'روشن چہرے' میں ممتاز حسن اور قرۃ العین کے خاکے معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ ان میں سحاب کا اسلوب شگفتہ اور ماضی کی یادوں سے منور ہے۔

خاکہ نگاری کے علاوہ سحاب نے سفر نامہ بھی لکھا۔ سفر نامہ گہرے مشاہدے اور تجزیے کا عکاس ہوتا ہے۔ سفر نامہ نگاری کی صنف میں آنکھوں دیکھے واقعات کو بیان کرنا ضروری امر ہے۔ سحاب قزلباش نے مختلف ملکوں کے سفر کیے لیکن یہ اسفار تفریح طبع کا مقصد لیے نہیں تھے بلکہ ذریعہ معاش کی صعوبتوں کے احوال سمیت رقم کیے گئے ہیں۔ سحاب نے ان ملکوں کے احوال بیان کرتے ہوئے ملک کی آب وہوا تہذیب و تمدن، رکھ رکھاؤ، معاشرت، کھانے اور اشخاص کا مطالعہ کر کے انھیں موضوع سخن بنایا ہے۔ اتنے کم صفحات میں انہوں نے مختلف ممالک کے واقعات بیان کیے ہیں۔ بعض جگہوں پر اختصار پسندی کے باعث سفر نامہ کے معیار پر تحریر پوری نہیں اترتی۔ پیرس کے میوزم لوغ کی تفصیل بتاتے ہوئے اس میں موجود نوادارات اور ایفل ٹاور کے بارے مفصل معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ سفر نامہ بیان کرتے ہوئے ان کا انداز سادہ اور سپاٹ ہے۔ انھوں نے جغرافیائی اور تاریخی مقامات کے ساتھ ساتھ زندہ کرداروں کو بھی شامل حال کیا ہے۔ انھوں نے سفر نامے میں تشبیہ واستعارے اور محاورات کا بر محل استعمال بھی کیا ہے۔ ایران کے سفر نامے میں ایران کی طرز زندگی، تہذیب و معاشرت کی عکاسی کی ہے۔ نائیجیریا کے سفر نامے میں وہاں کی خواتین کی زندگی میں درپیش مسائل کا تفصیلی ذکر پیش کیا ہے۔

سحاب قزلباش نے افسانہ نگاری اور غیر افسانوی نثر کے علاوہ شاعری میں بھی اپنی صلاحیتوں کو آزمایا۔ شاعری میں سب سے پہلے سلام پیش کیے ہیں۔ اس کے بعد حصہ غزل اور نظم ہیں۔ نظم میں پابند اور نثری نظمیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک طویل نظم بھی لکھی۔ سحاب نے اظہار بیان کے لیے تشبیہ و استعارات کا استعمال کیا ہے۔ ان کی

شاعری میں علامتی انداز بھی موجود ہے۔ دیر و حرم کی علامت متعدد بار استعمال کی ہے۔ وہ شاعری میں سراپا نگاری کا فن بھی بخوبی پیش کرتی ہیں۔ نظم 'اخبار بیچنے والی بڑھیا' میں بہترین انداز سے بڑھیا کی تصویر کشی کی ہے۔ سحاب کا شعری اسلوب جدت افکار کا نمونہ ہے۔ انھوں نے اپنے شعروں میں دور حاضر کے بدلتے تقاضوں کو بیان کیا ہے۔ ان کی نظموں کے موضوعات دور حاضر کے بہترین عکاس ہیں۔

بحیثیت مجموعی سحاب قزلباش نے مختلف اصناف ادب میں خدمات پیش کیں۔ ان کی کاوشیں خراج تحسین پیش کرنے کے قابل ہیں اگر وہ کسی ایک صنف ادب میں مزید طبع آزمائی کرتیں تو ان کی کوشش زیادہ بار آور ثابت ہوتی۔ افسانہ نگاری کی نسبت غیر افسانوی نثر اور شاعری میں ان کا اسلوب عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق جدت مضامین لیے ہے۔

حوالہ جات

۱۔ رشید امجد، ڈاکٹر، میراجی شخصیت اور فن، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۶ء)، ص ۱۲

۲۔ آغا آفتاب قزلباش، پیغام آشنا گویم، کراچی: مشمولہ افکار کراچی، فیض نمبر، شمارہ ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۹۶۵ء، ص ۲۳۹

مآخذ

- اثر،امدادامام۔کا شف الحقائق۔(مرتبہ) وہاب اشرفی، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۲ء۔
- اختر، سلیم۔اردوادب کی مختصر ترین تا ریخ (آغاز سے ۲۰۱۰ءتک)(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)۔
- اختر، سلیم۔جوہر عورت کی نمود۔ مشمولہ مخزن،لاہور: قائداعظم لائبریری، جلد ۱۱، شمارہ ۱، ۲۰۱۱ء۔
- اشرف ،راشد (مرتبہ) اردوکے نادروکمیاب شخصی خاکے۔جلداول ،کراچی:اٹلانٹس پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء۔
- اعجاز، خاور۔نئی پاکستانی اردو غزل (۱۹۷۰ءکی دہائی کے حوالے سے)،لاہور:ابلاغ پبلشرز، ۲۰۰۱ء۔
- اعظمی، شہاب ظفر۔اردو کے نثری اسالیب۔دہلی: تخلیق کار پبلشرز،۱۹۹۹ء۔
- الرحمٰن، شکیل۔منٹو شنا سی۔مرتبہ: جابر حسین۔پٹنہ:اردو مرکز، نومبر ۱۹۹۷ء۔
- امجد،رشید۔میرا جی شخصیت اور فن۔اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۶ء۔
- انصاری،اختر۔غزل اور غزل کی تعلیم۔لاہور:مکتبہ عالیہ،۱۹۸۷ء۔
- آغا،وزیر۔اردو شاعری کا مزاج۔لاہور: مجلس ترقی ادب،۲۰۰۸ء۔
- بخاری،ذوالفقار علی،سید۔ سرگزشت۔اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع اول،۲۰۱۱ء۔
- بریلوی، شفیق۔تذکرہ شاعرات پاکستان۔کراچی: مکتبہ خاتون پاکستان،۱۹۶۱ء۔
- بریلوی،عبادت۔جدید شاعری۔علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس،۲۰۰۵ء۔
- بیگ، خلیل احمد، مرزا،پروفیسر۔تنقید اور اسلوبیاتی تنقید۔علی گڑھ:مسلم یونیورسٹی،۲۰۰۵ء۔
- پروازی، پرویز، پروفیسر۔پس نوشت اور پس پس نوشت: خودنوشتوں کا جائزہ۔ لاہور: نیازمانہ پبلی کیشنز، س ن۔
- جالبی، جمیل۔ڈاکٹر،میرا جی ایک مطالعہ ۔دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۹۱ء۔
- جمال،انور،پروفیسر۔ادبی اصطلاحات ۔اسلام آباد: نیشنل بک فاونڈیشن،۲۰۰۴ء۔

- جمیل، عصمت۔نسائی شعور کی تاریخ۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۱۲ء۔
- حسن، فیضان، سید۔ آغا شاعر قزلباش دہلوی شخصیت اور شاعری۔دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۵ء۔
- حسن، یونس۔اردو میں نئی نظم تعارفی و تنقیدی مطالعہ، مشمولہ، قومی زبان۔کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان جلد ۷۶، شمارہ ۱۲، (۲۰۰۴ء)، ص ۳۵
- حسین، سرفراز، مرزا۔تحریک پاکستان میں مسلم خواتین کا کردار۔لاہور: نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن، ۲۰۰۴ء
- حسین، مجتبیٰ) مرتبہ)۔آغا شاعر حیات و شاعری۔کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۷۰ء۔
- حنا، زاہدہ۔ سحاب قزلباش: یادوں کی برسات ۔روزنامہ جنگ، (۲۰۰۴۔۰۸۔۱۶)
- حیدر، قرۃ العین، (مرتبہ و مقدمہ) انتخاب سجاد حیدر یلدرم۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء۔
- دانش، احسان۔جہان دگر۔لاہور: خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۱ء
- دہلوی۔اخلاق احمد۔یادوں کا سفر۔لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء
- رضوی، وقار احمد، سید۔ ہیت اور اسلوب۔ بشمولہ اسلوب اور اسلوبیات کی تعبیر و روایت منتخب مقالات، (مرتبہ) سیدہ محسنہ نقوی، پروفیسر، راولپنڈی: فرحان رضا پرنٹرز، ۲۰۱۵ء۔
- رضی ابدالی، محمد، سید، رہبران پاکستان، کراچی: ابدالی اکیڈمی، ۲۰۰۳ء۔
- زیدی، نظر حسین۔شخصیات و مباحث۔کراچی: مکتبہ مسعود، ۱۹۸۳ء۔
- سدید، انور۔اردو ادب میں سفر نامہ۔لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، س ن۔
- سدید، انور۔اردو ادب کی مختصر تاریخ۔ طبع پنجم، ۲۰۰۶ء۔
- سرور، آل احمد۔نظر اور نظریے۔کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۷ء۔
- سعید، طارق۔اسلوبیاتی تنقید وجہی سے قرۃ العین تک۔ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۳ء۔
- سکسینہ، رام بابو۔تاریخ ادب اردو۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء۔
- سیفی، بشیر۔خاکہ نگاری (فن و تنقید)۔راولپنڈی: شاخسار پبلشرز، ۱۹۹۰ء۔
- صدیقی، ابوالاعجاز حفیظ۔کشاف تنقیدی اصطلاحات۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء

- عابدی، رضا علی۔ برقی مراسلہ۔ بنام راقم الحروف۔ مورخہ ۲۰۱۷۔۸۔۰۶
- عابدی، رضا علی۔ ریڈیو کے دن۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء۔
- عابد، عابد علی۔ اسلوب۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء۔
- عبدالوحید۔ (چیف ایڈیٹر) جدید شعرائے اردو۔ لاہور: فیروز سنز، ۱۹۶۹ء۔
- عبداللہ، سیّد۔ اشارات تنقید۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء۔
- عبداللہ، سید۔ طیف نثر۔ (مرتبہ) ممتاز منگلوری، اشاعت دوم، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء۔
- عظیم، وقار۔ داستان سے افسانے تک۔ کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۰ء۔
- علی، مظفر، سید (مرتبہ)۔ سخن در سخن۔ کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۴ء۔
- فاروقی، شمس الرحمٰن۔ افسانے کی حمایت میں۔ نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۰۶ء۔
- فاروقی، ساقی۔ آپ بیتی پاپ بیتی۔ کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۹ء۔
- فاروقی، شمس الرحمن۔ تعبیر کی شرح۔ کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۴ء۔
- فاروقی، طاہر۔ اسلوب کے بارے میں مشمولہ قومی زبان، شمارہ ۱۰، جلد ۵۸، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، اکتوبر ۱۹۸۷ء۔
- فتح پوری، فرمان۔ اردو نثر کا فنی ارتقاء۔ لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء۔
- فتح پوری، فرمان۔ اردو رباعی فنی و تاریخی ارتقاء (لاہور: مکتبہ ایبک روڈ، انارکلی) ۲۰۰۱ء۔
- فیروز الدین، مولوی۔ فیروز اللغات۔ اردو جامع (نیا ایڈیشن)، لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، اشاعت پنجم، ۲۰۱۱ء۔
- فیض، فیض احمد، زنداں نامہ، دہلی: کبیر بک ڈپو، ۱۹۵۵ء۔
- قاضی، فردوس انور، پروفیسر۔ اردو ادب کے افسانوی اسالیب۔ لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۹ء
- قریشی، اکبر حسین۔ مطالعہ تلمیحات و اشارات اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۶ء
- قزلباش، آغا آفتاب۔ پیغام آشنا گویم۔ کراچی: مشمولہ افکار کراچی، فیض نمبر، شمارہ ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶۔ ۱۹۶۵ء۔
- قزلباش، سحاب۔ بدلیاں۔ دلی: ہندوستانی پبلشرز، ۱۹۴۶ء۔
- قزلباش، سحاب۔ روشن چہرے۔ کراچی: اشارات پبلی کیشنز، مارچ ۲۰۰۲۔

- قزلباش، سحاب۔لفظوں کے پیرہن۔کراچی:اشارات پبلی کیشنز، جنوری ۲۰۰۲ء۔
- قزلباش، سحاب۔ملکوں ملکوں شہروں شہروں۔کراچی: دانیال پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء۔
- قزلباش، سحاب۔میرا کوئی ماضی نہیں۔کراچی: فضلی سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۵ء۔
- کاظمی، روشن اختر۔اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقاء۔نئی دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۴ء۔
- مرزا، مبین (مرتبہ) ۔اردو کے بہترین شخصی خاکے (پہلی جلد)۔اسلام آباد: الحمرا پبلشنگ، اکتوبر ۲۰۰۲ء۔
- مہر، سلطانہ۔آج کی شاعرات۔کراچی: محراب ادب، ۱۹۷۳ء۔
- ناشاد، ارشد محمود۔ڈاکٹر، اردو غزل کا تکنیکی، ہیتی اورعروضی سفر۔لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء۔ نارنگ، گوپی چند۔ادبی تنقید اور اسلو بیات۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء۔
- نارنگ، گوپی چند۔اردو افسانہ روایت اور مسائل۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۳ء۔ نسیم، وحیدہ۔ عورت اور اردو زبان۔کراچی: غضنفر اکیڈمی پاکستان، ۱۹۷۹ء۔
- نیر، نورالحسن، مولوی۔نوراللغات (جلد اول۔الف۔ب) اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع سوم، ۱۹۸۹ء۔
- وکرم، نند کشور۔عالمی اردو ادب، دہلی: کرشن نگر، ۲۰۰۵ء۔

Websites

1) Encyclopedia of Arabic literature- volume-2,1998,page 798
2) Literary history toward a global perspective,2006,page 166
3) Dictionary of literary terms and literary theory, 2013, page 68
4) https://www.imdb.com/name/nm0702685/bio
5) www.thehindu.com/features/friday-review/enchantress-ones-more/aricles53257.ece
6) https://www.dawn.com/news/87676
7) www.biography.com/people/charles-dickens 9274087#synops

International Islamic University CENTRAL LIBRARY